الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

حقیقتِ واقعہ کا اعتراف سب سے بڑا قول ہے
اور حقیقتِ واقعہ سے مطابقت سب سے بڑا عمل

ستمبر ۱۹۸۲ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۷۰

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

ستمبر ۱۹۸۲
شمارہ ۷۰

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ کا زیر نظر شمارہ جزئی طور پر اجتماع نمبر ہے۔ اس میں مولانا وحید الدین خاں صاحب (صدر اسلامی مرکز) کی وہ تین تقریریں شائع کی جارہی ہیں جو بھوپال کے اجتماع (۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۲) کے موقع پر پیش کی گئی تھیں۔

پہلی تقریر میں اسلام اور اسلامی دعوت کی نظریاتی وضاحت ہے۔ دوسری تقریر میں صحابۂ کرام کی تصویر پیش کی گئی ہے جو ہمیشہ کے لئے اسلام اور اسلامی دعوت کا عملی نمونہ ہیں۔ تیسری تقریر میں اس عام سوال پر گفتگو کی گئی ہے کہ اسلامی مقصد کو بروے کار لانے کے لئے ہمارا پروگرام کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ شمارہ دل چسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اور الرسالہ اور اسلامی مرکز کے مشن کے عمومی تعارف کے لئے مفید ہوگا۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

احیاء اسلام

تمہید

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کا دین سربلند ہو۔ اس کو دنیا میں غالب فکر کا مقام حاصل ہو۔ مگر دین کے فکری غلبہ کے لئے عالمی حالات کی موافقت ضروری ہے۔ خدا نے ہزاروں سال کے عمل سے پیغمبر آخر الزماں کے لئے موافق حالات پیدا کئے۔ آپ نے ان حالات کو جانا اور ان کو حکیمانہ طور پر استعمال کرکے اسلام کو دنیا میں غالب فکر کا مقام عطا کیا۔

اب دوبارہ پچھلے ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں خدا نے وہ تمام موافق حالات جمع کر دئے ہیں جن کو استعمال کرکے از سر نو اسلام کو دنیا کا غالب فکر بنایا جاسکے۔ اسلام کو دوبارہ وہی برتری اور سربلندی حاصل ہو جو ماضی میں اسے حاصل تھی۔

مگر ان امکانات کو واقعہ بنانے کے لئے ایک ایسی سنجیدہ جدوجہد درکار ہے جو وقت کے گہرے شعور پر ابھری ہو۔ جو ردعمل کی نفسیات سے پاک ہوکر مثبت عمل کرنا جانتی ہو۔ جو ہر دوسرے احساس کو قربان کرکے صرف دین کی سربلندی کے لئے کوشش کرنے والی ہو۔ جو ربانی حکمت کی رہنمائی میں اٹھی ہو نہ کہ انسانی کج فہمیوں کی بنیاد پر۔ جس کا محرک خدا کی بڑائی قائم کرنا ہو نہ کہ قومی فخر اور مادی عظمت کا جھنڈا لہرانا۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی خدا کے دین کو سربلند کیا تھا اور ایسے ہی لوگ آج بھی خدا کے دین کو سربلند کریں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ سطحی نعروں پر بھیڑ جمع کرنے کو کام سمجھیں، جو ہر پیش آمدہ مسئلہ پر دوڑنا شروع کر دیں، وہ صرف خدا کے پیدا کئے ہوئے امکانات کو برباد کریں گے۔ وہ ان امکانات کو واقعہ بنانے والے ثابت نہیں ہوسکتے۔

ایک تقابل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو اسلامی انقلاب آیا اس میں تاریخی روایات کے مطابق کل ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے۔ اس انقلاب کی تکمیل ۲۳ سال میں ہوئی۔ ان ۲۳ سالوں میں جو غزوات پیش آئے ان کی تعداد ۸۱ بتائی جاتی ہے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ۲۷ غزوات میں شریک تھے اور عملاً باقاعدہ جنگ صرف چند ہی غزوات میں پیش آئی۔ ان لڑائیوں میں مجموعی طور پر ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس طرح ہے:

مسلمان مقتولین ۲۵۹

غیر مسلم مقتولین ۷۵۹ = ۱۰۱۸

صدر اول کا یہ انقلاب تاریخ کا عظیم ترین انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ اتنے بڑے انقلاب میں مقتولین کی یہ تعداد اتنی کم ہے کہ اس کو غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے لکھنے اور بولنے والے اکثر پُرجوش انداز میں اس انقلاب کا مقابلہ موجودہ زمانہ کے غیر اسلامی انقلابات سے کرتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب صرف ایک ہزار آدمیوں کی جان لے کر کامیاب ہو گیا۔ جبکہ فرانس میں جمہوری انقلاب لانے کے لئے اور روس میں اشتراکی انقلاب لانے کے لئے اتنے زیادہ آدمیوں کو قربان ہونا پڑا جن کی تعداد لاکھوں میں شمار ہوتی ہے۔

یہ تقابل ہم کو بہت پسند ہے کیونکہ اس میں ہماری پُرفخر نفسیات کو تسکین ملتی ہے۔ مگر یہاں تقابل کی ایک اور صورت ہے جس پر مسلمانوں نے کبھی غور نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ دوسرا تقابل نصیحت کا تقابل ہے اور نصیحت آدمی کے لئے ہمیشہ بہت کڑوی ہوتی ہے۔

یہ دوسرا تقابل یہ ہے کہ آپ صدر اول کی اسلامی دعوت میں مرنے والے کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں میں مرنے والوں سے کریں۔ بالفاظ دیگر، صدر اول کے انقلاب سے خود اپنی انقلابی کوششوں کا موازنہ کریں۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں دینی انقلاب اور اسلامی جہاد کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائی ہیں۔ مسلمان جس طرح زمانہ رسالت کے دینی انقلاب کا تقابل غیر مسلموں کے لادینی انقلابات سے کرتے ہیں۔ اسی طرح انھیں چاہئے کہ وہ زمانۂ رسالت کے انقلاب کو سامنے رکھ کر خود اپنی اٹھائی ہوئی تحریکوں کو تولیں اور ان کے نتائج کا جائزہ لیں۔

اگر مسلمان یہ تقابل کریں تو وہ حیرت انگیز طور پر پائیں گے کہ انھوں نے پیغمبر کی تحریک کے مقابلہ میں دوسری اقوام کی لادینی تحریکوں کو جس مقام پر کھڑا کر رکھا ہے، عین اسی مقام پر خود ان کی موجودہ زمانہ کی تحریکیں بھی کھڑی ہوئی ہیں ——— الجزائر کے جہاد آزادی میں ۲۵ لاکھ مسلمان مرے، ہندستان کے جہاد آزادی میں ۵ لاکھ علماء اور مسلمان شہید ہوئے، اسلامی پاکستان کو وجود میں لانے کے درمیان ایک کروڑ انسان کام آ گئے۔ اسی طرح شام، عراق، ایران، مصر، فلسطین اور دوسرے علاقوں میں جو لوگ اسلام کے نام پر جانیں دے رہے ہیں ان کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ ان تمام قربانیوں کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ صدر اول کی اسلامی تحریک میں دس سو آدمی کام آئے، اور اس کے بعد ایسا دور رس انقلاب آیا جس کے اثرات ساری دنیا نے محسوس کر لئے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں میں مجموعی طور پر دس کروڑ آدمی ہلاک اور برباد ہو گئے۔ اس کے باوجود زمین کے اوپر کوئی ایک چھوٹا سا خطہ بھی نہیں جہاں اسلامی انقلاب حقیقی معنوں میں کامیاب اور نتیجہ خیز نظر آتا ہو۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ سخت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری کوششوں کا بالکل الٹا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ ہمارے حق میں بائبل کے وہ الفاظ پورے ہوئے ہیں جو یہود کے بارے میں کہے گئے تھے ــــــــ "اور تمہارا بیج بونا فضول ہوگا کیونکہ تمہارے دشمن اس کی نصل کھائیں گے۔ اور جن کو تم سے عداوت ہے وہی تم پر حکمرانی کریں گے۔ اور تمہاری قوت بے فائدہ صرف ہوگی کیونکہ تمہاری زمین سے کچھ پیدا نہ ہوگا۔ اور میدان کے درخت پھلنے ہی کے نہیں۔" (احبار، باب ۲۶)

ہماری جدید تاریخ ان الفاظ کے عین مصداق ثابت ہو رہی ہے۔ ہم نے خلافت اسلامی اور اتحاد عالمی کی دھواں دھار تحریکیں چلائیں اور اس کی راہ میں ان گنت قربانیاں دیں۔ مگر جب نتیجہ نکلا تو ساری مسلم دنیا بہت سی قومی حکومتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ہم نے آزادیٔ وطن کے لئے جہاد کیا مگر جب وطن آزاد ہوا تو عملاً وہ دوسرے فرقوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ہم نے اسلامی پاکستان وجود میں لانے کے لئے قربانیاں دیں مگر جب اسلامی پاکستان بنا تو وہاں غیر اسلامی لیڈروں کی حکومت قائم تھی۔ ہم نے مصر میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کے لئے عظیم الشان تحریک اٹھائی مگر جب مصر کی قسمت کا فیصلہ ہوا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے فوجی حوصلہ مندوں کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ تقریباً ثلث صدی سے فلسطین کی یہودی ریاست کو مٹانے کے لئے جہاد جاری ہے اور مسلمانوں کا جان و مال بے پناہ مقدار میں تباہ ہو رہا ہے مگر عملاً صرف یہ ہوا ہے کہ یہودی ریاست کی قوت اور وسعت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آخری دردناک خبر جو بہت جلد مسلمانوں کو سننی ہوگی وہ یہ کہ ایران میں ناقابل بیان قربانیوں کے بعد اسلامی اقتدار لایا گیا مگر یہ اسلامی اقتدار بہت جلد ملحد طاقتوں کا اقتدار قائم ہونے کا ابتدائی زینہ بن گیا۔

یہ موجودہ زمانہ کی پتھر سے بھی زیادہ سنگین حقیقتیں ہیں۔ کوئی شخص یہ کر سکتا ہے کہ اپنے ذہن میں خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا کر اس میں جیتا رہے مگر آئندہ آنے والا مورخ یقیناً ہماری خوش خیالیوں کی تصدیق نہیں کرے گا۔ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ فرانس اور روس کے انقلاب میں مرنے والوں کے حصہ میں پھر بھی یہ فائدہ آیا کہ انھوں نے عالمی فکر کا دھارا موڑ دیا۔ اس کے بعد دنیا میں شہنشاہی طرز فکر کے بجائے جمہوری طرز فکر رائج ہو گیا اور سرمایہ دارانہ طریق معیشت پر سوشلسٹ طریق معیشت کو فکری غلبہ حاصل ہو گیا۔ مگر اسلام کے نام پر برباد ہونے والے اگرچہ تعداد میں ان سے بھی زیادہ تھے مگر وہ عالمی فکر پر کسی قسم کا اثر نہ ڈال سکے۔

صدر اول کا اسلامی انقلاب بتاتا ہے کہ اگر ایک ہزار آدمی بھی یہ ثبوت دے دیں کہ وہ خدا کے دین کی خاطر قربانی کی حد تک جانے کے لئے تیار ہیں تو خدا ان کی قربانی کو قبول کر کے اسلام کو زمین پر غالب کر دیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کروروں آدمیوں نے قربانی کا ثبوت دیا مگر خدا کی نصرت ان کا ساتھ دینے کے لئے آسمان سے نہیں اتری۔ وہ اس کے باوجود مغلوب ہی بنے رہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری یہ تمام قربانیاں حقیقۃً اس صراطِ مستقیم کے مطابق نہ تھیں جس کی پیروی پر خدا نے نصر عزیز اور فتح مبین کا وعدہ فرمایا ہے۔ (الفتح)

کوئی کسان اگر کہے کہ میں نے گیہوں کے بیج زمین میں ڈالے مگر اس سے گیہوں اگنے کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ اُگے تو ایسا کسان جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ خدا کی اس دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ آدمی گیہوں کے بیج بوئے اور اس سے اس کے لئے جھاڑ جھنکاڑ اگے۔ یہ ناممکن ہے، یہ کرور بار ناممکن ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں ہماری قربانیاں اگر فی الواقع اس راہ پر ہوتیں جس راہ پر رسول اور اصحاب رسول چلے اور اپنی جانیں دیں تو ناممکن تھا کہ اتنی غیر معمولی کوششوں کے باوجود اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلے۔ واقعات کا یہ کھلا ہوا فیصلہ ہے۔ اگر اس کے باوجود کوئی آدمی خوش فہمی کے گنبد میں رہنا چاہے تو رہے۔ بہت جلد قیامت اس کے گنبد کو توڑ دے گی۔ اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے لئے جھوٹی خوش فہمیوں کے کھنڈر کے سوا اور کچھ نہیں۔

نصرت خداوندی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان لانے والو، اگر تم خدا کی مدد کروگے تو خدا تمھاری مدد کرے گا۔ اور تمھارے قدموں کو جما دے گا (یا ایھا الذین آمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم، محمد ۷) یہاں خدا کی نصرت کرنے سے مراد خدا کی اسکیم کے ساتھ موافقت ہے، یعنی واقعات کو ظہور میں لانے کے لئے خدا کا جو نقشہ ہے اور اس کے لئے اس نے جو موافق حالات فراہم کئے ہیں ان کے ساتھ اپنی کوششوں کو جوڑ دینا، جو لوگ اس طرح خدا کی نصرت کریں ان کو جماؤ حاصل ہوتا ہے اور بالآخر وہ کامیاب رہتے ہیں۔ خدا کی اس دنیا میں خدائی منصوبہ سے مطابقت کرکے ہی کوئی نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے نہ کہ بطور خود آزادانہ عمل کرکے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ایک پادری صاحب اپنے مکان کے سامنے ایک ہرا بھرا درخت دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر میں اس کا بیج بوؤں تو وہ دس سال میں پورا درخت بنے گا۔ انھوں نے ایسا کیا کہ کہیں سے ایک بڑا درخت کھدوایا پھر کئی آدمیوں کے ذریعہ اس کو وہاں سے اٹھوایا اور اس کو لاکر اپنے گھر کے سامنے لگا دیا۔ وہ خوش تھے کہ انھوں نے دس سال کی مدت ایک دن میں طے کرلی ہے، لیکن اگلے دن جب وہ صبح کو سو کر اٹھے تو ان کو یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ درخت کے پتے مرجھا چکے ہیں۔ شام تک شاخیں بھی لٹک گئیں۔ چند دن کے بعد درخت کے پتے سوکھ کر جھڑ گئے اور اس کے بعد ان کے گھر کے سامنے صرف لکڑی کا ایک ٹھنٹھ کھڑا ہوا تھا۔

انھیں دنوں پادری صاحب کا ایک دوست ان سے ملنے کے لئے آیا۔ دوست نے دیکھا کہ پادری صاحب اپنے گھر کے سامنے بے چینی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ اس نے کہا، آج میں آپ کو غیر معمولی طور پر پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے۔ پادری صاحب نے جواب دیا ——— میں جلدی میں ہوں مگر خدا جلدی نہیں چاہتا:

I am in hurry, but God doesn't

اس کے بعد پادری صاحب نے درخت کے مذکورہ قصہ کو بتاتے ہوئے کہا کہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں ان میں ایک حصہ خدا کا ہوتا ہے اور ایک حصہ انسان کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو دندانہ دار پہیوں (Cog Wheels) کے ملنے سے مشین کا چلنا۔ ایک پہیہ خدا کا ہے، دوسرا پہیہ انسان کا۔ انسان جب خدا کے پہیہ کا ساتھ دیتا ہے تو وہ کامیاب رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ خدا کے پہیے کی رفتار کا لحاظ کئے بغیر چلنا چاہے تو وہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ خدا کا پہیہ مضبوط ہے اور انسان کا پہیہ کمزور۔

خدا نے کروروں سال کے عمل سے زمین کے اوپر زرخیز مٹی کی تہ بچھائی جس کے اوپر کوئی درخت اگے۔ سورج کے ذریعہ اوپر سے ضروری حرارت بھیجی۔ آفاقی اہتمام کے تحت پانی مہیا فرمایا۔ موسموں کی تبدیلی کے ذریعہ اس کی پرورش کا انتظام کیا۔ کھرب ہا کھرب کی تعداد میں بیکٹیریا پیدا کئے جو درخت کی جڑوں کو نائٹروجن کی غذا فراہم کریں۔ یہ تمام انتظام گویا خدا کا دندانہ دار پہیہ (Cog Wheel) ہے۔ اب انسان کو اس میں اپنا دندانہ دار پہیہ ملانا ہے تاکہ مذکورہ مواقع اس کے لئے درخت کی صورت اختیار کرسکیں۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایک بیج لے اور اس کو زمین میں دبا دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو گویا اس نے خدا کے پہیے میں اپنے پہیے کو ملایا۔ اس کے بعد فطرت کی مشین چلنا شروع ہو جائے گی اور وقت پر اپنا نتیجہ دکھائے گی۔ اس کے برعکس اگر انسان اپنا بیج پتھر پر ڈال دے، یا بیج کے بجائے اس کے ہم شکل پلاسٹک کے دانے زمین میں بوئے، یا وہ ایسا کرے کہ بیج بونے کے بجائے پورا درخت اکھاڑ کر لائے اور اس کو اپنی زمین میں اچانک کھڑا کرنا چاہے تو گویا اس نے اپنا پہیہ خدا کے پہیے میں نہیں ملایا، اس نے اپنے آپ کو خدا کے منصوبے میں شامل نہیں کیا۔ ایسے آدمی کے لئے اس دنیا میں ہرے بھرے درخت کا مالک بننا مقدر نہیں۔

یہی معاملہ اسلامی انقلاب کا بھی ہے۔ وہ بھی خدا کے پیدا کردہ مواقع کو سمجھنے اور ان کو استعمال کرنے سے ظہور میں آتا ہے، نہ کہ خود ساختہ قسم کی اچھل کود مچانے سے۔ صدر اول میں جو انقلاب آیا وہ اس لئے آیا کہ خدا کے کچھ بندوں نے اپنا پہیہ خدا کے پہیہ میں ملا دیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ میں ہماری تمام قربانیاں اس لئے رائگاں چلی گئیں کہ ہم نے خدائی منصوبہ کے ساتھ موافقت نہیں کی بلکہ خود ساختہ راہوں میں غیر متعلق قسم کی

ہنگامہ آرائیاں کرتے رہے۔

دین توحید اور دین شرک

قرآن کے اشارات (البقرہ ۲۱۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے بعد جب انسان زمین پر آباد ہوا تو سب کا دین توحید تھا۔ یہ صورت چند سو سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد لوگوں کے اندر مظاہر پرستی کا آغاز ہوا جس کا دوسرا نام شرک ہے۔ دکھائی نہ دینے والے خدا کو اپنا مرکز توجہ بنانا انسان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ اس نے عقیدۃً خدا کو مانتے ہوئے یہ کیا کہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنالیا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش شروع ہوئی۔ پہاڑوں اور سمندروں کو دیوتا سمجھ لیا گیا۔ حتیٰ کہ انسانوں میں سے جس کے پاس عظمت و اقتدار نظر آیا اس کو بھی خدا کا شریک فرض کر لیا گیا۔ اس طرح تقریباً ایک ہزار سال بعد وہ وقت آیا جب کہ توحید کا فکری غلبہ ختم ہو گیا۔ اور انسانی ذہن پر دین شرک غالب آ گیا۔

ابتدائی دین توحید میں اس بگاڑ کے بعد خدا نے اپنے پیغمبر بھیجنے شروع کئے۔ مگر ان پیغمبروں کو کبھی اتنی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی کہ دین شرک کو مٹا کر دوبارہ دین توحید کو غالب اور سربلند کرتے۔ انسانی نسل اس زمانہ میں جن جن مقامات پر پھیلی تھی، ہر مقام پر خدا کے پیغمبر لگاتار آتے رہے (المومنون ۴۴) ایک حدیث کے مطابق ان پیغمبروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔ مگر تمام پیغمبروں کا یہ حال ہوا کہ ان کو استہزار کا موضوع بنالیا گیا (یس ۳۰)

جب آدمی سچائی کا انکار کرتا ہے، بلکہ اس کا مذاق اڑانے پر اتر آتا ہے تو یہ خواہ مخواہ نہیں ہوتا۔ ایسا رویہ آدمی ہمیشہ کسی چیز کے بل پر اختیار کرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ناز ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فلما جاءتهم رسلهم بالبينات فرحوا بما عندهم من العلم وحاق بهم ما كانوا به يستهزؤن المومن ۸۳	جب ان کے پاس ان کے رسول دلائل لے کر آئے تو وہ اس علم پر مگن رہے جو ان کے پاس تھا اور ان کو گھیر لیا اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

یہاں "علم" سے مراد وہ بگڑا ہوا مذہب ہے جو زمانہ گزرنے کے بعد ان قوموں کے نزدیک مقدس بن گیا تھا۔ اس قسم کا آبائی مذہب ہمیشہ ایک قائم شدہ مذہب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مانے ہوئے بزرگوں کے نام وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے اوپر بڑے بڑے ادارے چل رہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر ان کا پورا قومی ڈھانچہ کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو لمبی روایات کے نتیجہ میں عظمت کا سب سے اونچا مقام مل چکا ہوتا ہے۔

ان قوموں کے پاس ایک طرف ان کا یہ مسلمہ مذہب تھا جو شرک کی بنیاد پر قائم تھا۔ دوسری طرف پیغمبر ایک ایسی توحید کی آواز بلند کرتا جو وقت کے ماحول میں اجنبی ہوتی تھی۔ اس کا داعی حق ہونا ایک ایسے

دعوے کی حیثیت رکھتا تھا جس کی پشت پر ابھی تاریخ کی تصدیقات جمع نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے پاس اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے لفظی دلیل کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس تقابل میں انھیں وقت کا پیغمبر واضح طور پر حقیر نظر آتا اور ان کا اپنا آبائی مذہب واضح طور پر عظیم۔ حضرت مسیح بے گھر تھے اور درخت کے نیچے سوتے تھے۔ دوسری طرف یہودیوں کا مذہبی سردار ہیکل کی عظیم عمارت میں جلوہ افروز تھا۔ پھر ہیکل کے صدر نشین کے مقابلہ میں درخت کے نیچے سونے والا لوگوں کو زیادہ برسرحق کیسے نظر آتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قومیں اپنے معاصر پیغمبروں کو استہزار کا موضوع بناتی رہیں۔ اس استہزار پر جو چیز انھیں آمادہ کرتی وہ ان کا یہ احساس تھا کہ ہم تو مسلّمہ اکابر کا دامن تھامے ہوئے ہیں، پھر ان کے مقابلہ میں اس معمولی آدمی کی کیا حیثیت۔ اکابر کی اس فہرست میں اگرچہ قدیم انبیا تک ہوتے تھے۔ مگر ان انبیار کی حیثیت عملاً ان کے یہاں ایک قسم کے قومی ہیرو کی تھی نہ کہ فی الواقع داعیٔ حق کی۔

اعلار کلمۃ اللہ

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑکوں کے چوراہے پر کھمبا لگا ہوتا ہے جس میں ہری اور لال روشنیاں ہوتی ہیں۔ جس رخ پر ہری روشنی ہو ادھر سواریوں کو جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اور جس رخ پر لال روشنی ہو رہی ہو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادھر سواریاں نہ جائیں۔ اگر کوئی سواری اس نشان دہی کی خلاف ورزی کرے تو وہ ٹریفک قوانین کے مطابق قابل سزا قرار پاتی ہے۔

داعیٔ حق کی حیثیت اصلاً اسی قسم کے رہنما کھمبا کی ہے۔ وہ خدا کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے کہ زندگی کے راستوں پر کھڑا ہو کر لوگوں کو بتائے کہ وہ کدھر جائیں اور کدھر نہ جائیں۔ کون سا راستہ جنت کی طرف جا رہا ہے اور کون سا جہنم کی طرف۔ (وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا)

ابتدائی دور توحید کے بعد غلبۂ شرک کے زمانے میں خدا کی طرف سے جو رسول آئے وہ اسی خاص مقصد کے لئے آئے۔ ان کو خدا نے حقیقت کا صحیح علم دے کر کھڑا کیا کہ وہ قوموں کی رہنمائی کریں اور ان کو یہ بتائیں کہ کہ دنیا کی زندگی میں ان کے لئے صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ ہر نبی نے اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح انجام دیا۔ انھوں نے ان کی قابلِ فہم زبان میں دلائل کی پوری قوت کے ساتھ لوگوں کے سامنے حق کو پیش کیا اور مسلسل اتنی وضاحت کی کہ ان کے مخاطبین کے سامنے اتمام حجت کی حد تک خدا کا پیغام پہنچ گیا پھر جس نے رسول کا ساتھ دیا وہ خدا کے نزدیک جنتی ٹھہرا۔ جس نے رسول کو نہ مانا وہ سرکش اور باغی قرار دے کر جہنم میں ڈال دیا گیا۔

تاہم اللہ تعالیٰ کو حق کے اعلان کے ساتھ یہ بھی مطلوب تھا کہ دوبارہ حق کا اظہار ہو۔ حق کا اعلان تو یہ ہے

کہ لوگوں کو حق کے بارے میں پوری طرح بتا دیا جائے۔ خیر خواہی اور حکمت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کو اس طرح کھول دیا جائے کہ سننے والوں کے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔ ہم یہ جانتے ہی نہ تھے کہ زندگی میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اسی کا نام اتمام حجت ہے۔

اظہار اس سے آگے کی چیز ہے۔ اظہار کا مطلب یہ ہے کہ دینی فکر دنیا کا غالب فکر بن جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے افکار پست اور مغلوب ہو کر رہ جائیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اظہار دین یا اعلاء کلمۃ اللہ سے مراد اصلاً حدود و قوانین کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فکری غلبہ ہے۔ یعنی اسی قسم کا غلبہ جیسا غلبہ موجودہ زمانہ میں جدید علوم کو قدیم روایتی علوم پر حاصل ہوا ہے۔ مثلاً سرمایہ داری پر سوشلزم کا فکری غلبہ، شہنشاہیت پر جمہوریت کا فکری غلبہ اور قیاسی فلسفہ پر تجرباتی سائنس کا فکری غلبہ۔ جدید سائنسی دنیا میں بعض علوم نے غالب علم کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اور بعض دوسرے علوم نے ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کھو دی ہے۔ اسی قسم کا غلبہ دین حق کا بھی دین باطل کے اوپر مطلوب ہے۔

خدا قادر مطلق ہے۔ اس کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ حق کو دوسری باتوں پر فائق و برتر کر دے جس طرح اس نے سورج کی روشنی کو دوسری تمام زمینی روشنیوں پر فائق کر رکھا ہے۔ مگر موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا اپنے مطلوب واقعات کو اسباب کے روپ میں ظاہر کرتا ہے نہ کہ معجزات کے روپ میں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اسباب کے دائرہ میں اس مقصد کے لئے تمام ضروری حالات پیدا کئے جائیں اور اس کے بعد ایک ایسا پیغمبر بھیجا جائے جس کو خصوصی طور پر غلبہ کی نسبت دی گئی ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کر کے نہ صرف حق کا اعلان کرے بلکہ حق کا اظہار بھی کر دے تاکہ خدا کے بندوں پر خدا کی نعمت کا اتمام ہو اور ان پر ان برکتوں کے دروازے کھلیں جو ان کی نادانی سے ان کے اوپر بند پڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی ان آیتوں میں کہی گئی ہے:

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون ○ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ○	وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ وہ منکروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام دین پر غالب کر دے خواہ وہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو
الصف ۸ - ۹	

ایک نئی قوم برپا کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انا دعوۃ ابراھیم (میں ابراہیم کی دعا ہوں) حضرت ابراہیمؑ

نے کعبہ کی تعمیر کے وقت یہ دعا کی تھی کہ اے خدا تو میرے لڑکے اسمٰعیل کی اولاد میں ایک نبی پیدا کر (البقرہ ۱۲۹) تاہم حضرت ابراہیم کی دعا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان تقریباً ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت زکریا نے اپنی اولاد میں ایک پیغمبر پیدا کئے جانے کی دعا کی تو ایک سال کے اندر ہی آپ کے یہاں حضرت یحییٰ پیدا ہو گئے (آل عمران ۳۹) اور حضرت ابراہیم نے اسی قسم کی دعا فرمائی تو اس کی عملی قبولیت میں ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔

اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یحییٰ کو ایک وقتی کردار ادا کرنا تھا۔ آپ اس لئے بھیجے گئے کہ یہود کے دینی بھرم کو کھولیں اور بالآخر ان کے ہاتھوں قتل ہو کر یہ ثابت کریں کہ یہود اب اتنا بگڑ چکے ہیں کہ انھیں معزول کر دیا جائے اور ان کی جگہ دوسری قوم کو کتاب الٰہی کا حامل بنایا جائے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبر اسلام کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب فکر کی حیثیت دے دیں۔ اس کام کو اسباب کے ڈھانچہ میں انجام دینے کے لئے ایک نئی صالح قوم اور موافق حالات درکار تھے۔ یہی وہ قوم اور یہی وہ حالات ہیں جن کو وجود میں لانے کے لئے ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔

اس منصوبہ کے تحت حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا کہ وہ عراق کے متمدن علاقہ سے نکلیں اور حجاز کے خشک اور غیر آباد مقام پر اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو لا کر بسا دیں (ابراہیم ۳۷) یہ مقام اس وقت وادیٔ غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ یہاں تمدنی آلائشوں سے دور رہ کر خالص فطرت کی آغوش میں ایک ایسی قوم کی تعمیر کی جا سکتی تھی جس کے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطری صلاحیتیں محفوظ ہوں۔ (ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک، البقرہ ۱۲۸) قبولیت دعا میں ڈھائی ہزار سالہ تاخیر کا واضح مطلب یہ تھا کہ مخصوص ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ وہ جاندار قوم وجود میں آئے جو خدا کے دین کی سچی حامل بن سکے۔ جو پورے معنوں میں ایک جان دار قوم ہو اور ان تمام مصنوعی کمیوں سے پاک ہو جن کی وجہ سے دور اول میں خدا کے دین کے اظہار کے لئے کارآمد آدمی نہ مل سکے۔ جب منصوبہ کے مطابق مکمل اسٹیج تیار ہو گیا اس وقت بنو ہاشم کے یہاں آمنہ بنت وہب کے پیٹ سے وہ پیغمبر غلبہ پیدا کر دیا گیا جس کی دعا حضرت ابراہیم کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیم نے خدا کے حکم سے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو موجودہ مکہ کے مقام پر لا کر بسا دیا جہاں اس وقت سوکھی زمین اور خشک پتھروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب مشک کا پانی ختم ہو گیا اور اسماعیل پیاس کی شدت سے ہاتھ پاؤں مارنے لگے تو خشک بیابان میں زمزم کا چشمہ نکل آیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ خدا نے اگرچہ تم کو بڑے سخت محاذ پر کھڑا کیا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرے گا کہ تم کو بے سہارا چھوڑ دے۔ تمہارا معاملہ خدا

کا معاملہ ہے اور خدا ہر نازک موڑ پر تمھاری مدد کے لئے موجود رہے گا۔ اسماعیل جب نوجوانی کی عمر کو پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس خواب کو انھوں نے حکم خداوندی سمجھا اور بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے مگر عین اس وقت جب کہ ان کی چھری اسماعیل کے گلے پر پہنچ چکی تھی خدا نے آواز دے کر انھیں روک دیا اور اس کے بدلے انھیں ایک مینڈھا دیا جس کو وہ خدا کے نام پر ذبح کریں۔ یہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ تم سے اگرچہ ہم نے بہت بڑی قربانی مانگی ہے مگر یہ صرف جذبہ کا امتحان ہے۔ قربانی پیش تو کرنا ہوگا مگر ابھی قربان ہونے کی نوبت نہیں آئے گی کہ خدا تمھیں بچا لے گا۔ کیونکہ اصل مقصد تم کو ایک بڑے کام کے لئے استعمال کرنا ہے نہ کہ خواہ مخواہ ہلاک کر دینا۔

حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلۂ جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جو زمزم نکلنے کے بعد آکر مکہ میں آباد ہو گیا تھا۔ حضرت ابراہیم جو اس وقت شام میں تھے، ایک روز گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اس وقت گھر پر اسماعیل نہ تھے، صرف ان کی بیوی موجود تھیں جو اپنے خسر کو پہچانتی نہ تھیں، حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ اسماعیل کہاں گئے ہیں، بیوی نے کہا کہ شکار کرنے کے لئے۔ پھر پوچھا کہ تم لوگوں کی گزر کیسی ہوتی ہے۔ بیوی نے معاشی تنگی اور گھر کی ویرانی کی شکایت کی، اس کے بعد حضرت ابراہیم واپس چلے گئے اور خاتون سے کہا کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ اپنی چوکھٹ کو بدل دو (غیر عتبۃ بابك) حضرت اسماعیل نے واپسی کے بعد جب پورا واقعہ سنا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ میرے باپ تھے جو ہمارا حال دیکھنے آئے تھے اور "چوکھٹ بدل دو" کا مطلب استعارے کی زبان میں یہ ہے کہ اس بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی کر لو، کیونکہ وہ اس نسل کو پیدا کرنے کے لئے موزوں نہیں جس کا منصوبہ خدا نے بنایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس بیوی کو طلاق دے دی اور دوسری عورت سے شادی کر لی۔ اس کے کچھ دن بعد حضرت ابراہیم دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے، اب بھی اسماعیل گھر پر موجود نہ ملے۔ حضرت ابراہیم نے دوسری بیوی سے بھی وہی سوال کیا جو انھوں نے پہلی بیوی سے کیا تھا۔ اس بیوی نے اسماعیل کی تعریف کی اور کہا کہ جو کچھ ہے بہت اچھا ہے، سب خدا کا شکر ہے، اس کے بعد حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ چوکھٹ کو قائم رکھو (ثبت عتبۃ بابك) یعنی تمھاری یہ بیوی پیش نظر منصوبہ کے لئے بالکل ٹھیک ہے، اس کے ساتھ اپنا تعلق باقی رکھو (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح عرب کے الگ تھلگ علاقے میں اسماعیل کے ابتدائی خاندان سے ایک نئی نسل بننا شروع ہوئی جس نے بالآخر اس جاندار قوم (بنو اسماعیل) کی صورت اختیار کی جو نبی آخر الزماں کا گہوارہ بن سکے اور تاریخ کی اس عظیم ترین ذمہ داری کو سنبھالے جو خدا اس کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔

یہ قوم جو عرب کے صحراؤں اور چٹیل بیابانوں میں تیار ہوئی، اس کی خصوصیات کو ایک لفظ میں المروۃ کہا جاسکتا ہے۔ المروۃ کے لفظی معنی ہیں مردانگی۔ یہ عربوں کے یہاں کسی کے جوہر انسانیت کو بتانے کے لئے سب سے اونچا لفظ سمجھا جاتا تھا۔ قدیم عربی شاعر کہتا ہے:

اذا المرء اعیته المروۃ ناشئا فمطلبها کهلا علیه شدید

(آدمی اگر اٹھتی جوانی میں مردانگی کا مقام حاصل کرنے سے عاجز رہ جائے تو بڑھاپے میں اس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے)

پروفیسر فلپ ہٹی نے عرب تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عرب کے بیابانوں میں صدیوں کے عمل سے جو قوم تیار ہوئی وہ دنیا کی ایک نرالی قوم تھی جو مندرجہ ذیل اخلاقی صفات میں کمال درجہ رکھتی تھی:

> Courage, endurance in time of trouble (sabr) observance of the rights and obligations of neighbourliness (jiwar) manliness (muruah) generosity and hospitality, regard for women and fulfilment of solemn promises. (P. 253)

ہمت، مشکل کے وقت برداشت، پڑوسی کے حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی، مردانگی، فیاضی اور مہمان نوازی، عورتوں کی عزت اور وعدہ کر لینے کے بعد اسے پورا کرنا۔

خیر امت

اس طرح ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ ایک ایسی قوم نکالی گئی جو اپنے انسانی اوصاف کے اعتبار سے تمام قوموں میں سب سے بہتر تھی (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، آل عمران ۱۱۰) حضرت عبداللہ بن عباس نے خیر امت سے مہاجرین کا گروہ مراد لیا ہے (هم الذین هاجروا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ الی المدینۃ، تفسیر ابن کثیر) مہاجرین دراصل اس گروہ کی علامت تھے۔ باعتبار حقیقت اس سے وہ پورا عرب گروہ مراد ہے جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

پیغمبروں کو ہر زمانہ میں ایک ہی سب سے بڑی رکاوٹ پیش آئی ہے۔ ان کی مخاطب قوموں کے پاس جو آبائی دین ہوتا تھا اس کے ساتھ مادی رونقیں اور در و دیوار کی عظمتیں شامل ہوتی تھیں۔ دوسری طرف وقت کا پیغمبر دلیل مجرد کی سطح پر کھڑا ہوتا تھا۔ عرب میں جو قوم تیار ہوئی اس کے اندر یہ انوکھی صفت تھی کہ وہ حق کو دلیل مجرد کی سطح پر پا سکے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے حق کے حوالے کر دے جس نے اپنی ظواہر کا روپ اختیار نہیں کیا ہے۔ کھلے آسمان اور وسیع صحراؤں کے درمیان جو قوم تیار ہوئی وہ حیرت انگیز طور پر اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی تھی کہ حقیقت کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھ سکے، وہ ایک ایسے حق کے لئے اپنا سب کچھ سونپ دے جس سے بظاہر دنیا میں کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ اصحاب رسول کی اس خصوصیت کو حضرت عبداللہ بن مسعود نے تین

لفظوں میں اس طرح ادا کیا ہے: وہ اس امت کے سب سے افضل لوگ تھے۔ وہ سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرا علم رکھنے والے اور سب سے کم تکلف والے تھے۔ اللہ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور دین کے قیام کے لئے چن لیا تھا (کانوا افضل ھذہ الامۃ ابرّھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ ولاقامۃ دینہ)

دور شرک میں انسان سے سب سے اہم صفت جو کھوئی گئی تھی، وہ تھی ——— حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت۔ اب انسان حقیقت کو محسوسات اور مظاہر کی سطح پر دیکھتا تھا، وہ حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ یہی اصل رکاوٹ تھی جس کی وجہ سے پچھلے زمانے میں نبیوں کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔

وہ خدا کے منکر نہ تھے مگر انھوں نے خدا کو محسوسات کے پیکر میں ڈھال لیا تھا۔ وہ غیب میں چھپے ہوئے خدا کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے نظر آنے والی چیزوں کو خدائی کا پیکر فرض کر کے ان کو اپنا مرکز توجہ بنا لیا تھا، خواہ یہ مادی بڑائیاں ہوں یا انسانی بڑائیاں۔ ان کی یہی کمزوری پیغمبر کی پیغمبری پر یقین کرنے میں مانع تھی۔ ہر پیغمبر جب آتا ہے تو اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے وہ محض ایک انسان ہوتا ہے۔ ابھی اس کے نام کے ساتھ وہ تاریخی بڑائیاں شامل نہیں ہوتیں جو بعد کے دور میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں فرمایا تھا: اے میرے رب، اس شہر (مکہ) کو تو امن والا شہر بنا دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے دور رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے میرے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک ایسے میدان میں بسایا ہے جہاں کھیتی نہیں، تیرے محترم گھر کے پاس، اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں (ابراہیم ۳۷-۳۵)

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں شرک کا غلبہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ عالی شان بت خانے ہر طرف قائم تھے۔ انسان کے لئے بظاہر ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ہٹ کر سوچ سکے۔ اس وقت اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے ایک چٹیل زمین میں ایک نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ ایک محفوظ علاقہ میں ایسے افراد تیار کرنے کا منصوبہ تھا جو ظواہر سے اوپر اٹھ کر حقائق کا پرستار بن سکے۔ چنانچہ اسی انسانی مادہ سے وہ قوم بنی جس کے متعلق قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں:

ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان	مگر اللہ نے ایمان کو تمھارے لئے محبوب بنا دیا اور اس کو تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور تمھارے لئے کفر

اولئک ھم الراشدون (الحجرات ۷) اور فسق اور نافرمانی کو قابل نفرت بنا دیا۔ یہی لوگ راہ راست والے ہیں۔

اس آیت کو ہم اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب کہ اس کو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں رکھ کر دیکھیں جب کہ اصحاب رسول کے ایمان کا واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے دکھائی دینے والے خداؤں کے ہجوم میں دکھائی نہ دینے والے خدا کو پایا اور اس کو اپنا سب کچھ بنا لیا۔ عظمت کے مناروں کے درمیان انھوں نے عظمتوں سے خالی پیغمبر کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ ایک دین غریب (اجنبی دین) اپنی ساری بے سر و سامانی کے باوجود ان کی نظر میں اتنا محبوب ہو گیا کہ اس کی خاطر کوئی بھی قربانی کرنا ان کے لئے مشکل نہ رہا۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے ایک ایسی سچائی کو دیکھ لیا جو ابھی مجرد روپ میں تھی۔ جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ جو ابھی قومی فخر کا نشان نہیں بنا تھا۔ جس میں اپنا سب کچھ دے دینا تھا۔ مگر دنیا میں اس کے بدلے کچھ بھی پانا نہ تھا۔

اس معاملہ کی ایک نمائندہ مثال وہ ہے جو ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت پیش آئی۔ عین اس زمانہ میں جب کہ مکہ میں اسلام کے حالات بے حد تنگ ہو چکے تھے، مدینہ میں کچھ مسلمانوں کی تبلیغ سے اسلام پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ ہر گھر میں داخل ہو گیا۔ اس وقت مدینہ کے کچھ لوگوں نے طے کیا کہ وہ مکہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نصرت کی بیعت کریں اور آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ آنے کی دعوت دیں۔ حضرت جابر انصاری کہتے ہیں کہ جب مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پہنچ گیا تو ہم نے مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم اللہ کے رسول کو اس حال میں چھوڑے رکھیں کہ آپ مکہ کے پہاڑوں میں پریشان اور ڈرے سہمے پھرتے رہیں (ثم ائتمروا جمیعا فقلنا حتی متی نترک رسول اللہ یطوف ویطرد فی جبال مکۃ ویخاف) رسول اللہ کا بے یار و مددگار ہونا ظاہر بینوں کے لئے اس بات کا ثبوت تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہی نہیں۔ اگر اللہ کے رسول ہوتے تو آپ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ مگر اہل مدینہ نے آپ کے معاملہ کو حقیقت کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے یہ راز پا لیا کہ آپ کا معاملہ ایک خدائی معاملہ ہے اور آپ کی مدد کر کے وہ خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ کے ستر سے کچھ اوپر نمائندوں نے مکہ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت کیسے نازک حالات میں ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وفد کے ایک رکن کعب بن مالک انصاری کہتے ہیں کہ ہم مدینہ سے مکہ کے لئے اس طرح روانہ ہوئے کہ ہمارا قبیلہ جو حسب معمول زیارت کعبہ کے لئے جا رہا تھا اس کے ساتھ خاموشی سے حج کے نام پر شریک ہو گئے۔ مکہ کے قریب قبیلہ والوں نے پڑاؤ ڈالا۔ رات کے وقت ہم دوسروں کی طرح ان کے ساتھ سو گئے۔ یہاں تک کہ جب رات کا تہائی

اولئک ھم الراشدون (الحجرات ۷) اور فسق اور نافرمانی کو قابل نفرت بنا دیا۔ یہی لوگ راہ راست والے ہیں۔

اس آیت کو ہم اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب کہ اس کو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں رکھ کر دیکھیں۔ جب کہ اصحاب رسول کے ایمان کا واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے دکھائی دینے والے خداؤں کے ہجوم میں دکھائی نہ دینے والے خدا کو پایا اور اس کو اپنا سب کچھ بنا لیا۔ عظمت کے مناروں کے درمیان انھوں نے عظمتوں سے خالی پیغمبر کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ ایک دین غریب (اجنبی دین) اپنی ساری بے سر و سامانی کے باوجود ان کی نظر میں اتنا محبوب ہو گیا کہ اس کی خاطر کوئی بھی قربانی کرنا ان کے لئے مشکل نہ رہا۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے ایک ایسی سچائی کو دیکھ لیا جو ابھی مجرد روپ میں تھی۔ جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ جو ابھی قومی فخر کا نشان نہیں بنا تھا۔ جس میں اپنا سب کچھ دے دینا تھا۔ مگر دنیا میں اس کے بدلے کچھ بھی پانا نہ تھا۔

اس معاملہ کی ایک نمائندہ مثال وہ ہے جو ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت پیش آئی۔ عین اس زمانہ میں جب کہ مکہ میں اسلام کے حالات بے حد تنگ ہو چکے تھے، مدینہ میں کچھ مسلمانوں کی تبلیغ سے اسلام پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ ہر گھر میں داخل ہو گیا۔ اس وقت مدینہ کے کچھ لوگوں نے طے کیا کہ وہ مکہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نصرت کی بیعت کریں اور آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ آنے کی دعوت دیں۔ حضرت جابر انصاری کہتے ہیں کہ جب مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پہنچ گیا تو ہم نے مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم اللہ کے رسول کو اس حال میں چھوڑے رکھیں کہ آپ مکہ کے پہاڑوں میں پریشان اور ڈرے سہمے پھرتے رہیں (ثم ائتمروا جمیعا فقلنا حتی متی نترک رسول اللہ یطوف ویطرد فی جبال مکۃ ویخاف) رسول اللہ کا بے یار و مددگار ہونا ظاہر بینوں کے لئے اس بات کا ثبوت تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہی نہیں۔ اگر اللہ کے رسول ہوتے تو آپ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ مگر اہل مدینہ نے آپ کے معاملہ کو حقیقت کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے یہ راز پا لیا کہ آپ کا معاملہ ایک خدائی معاملہ ہے اور آپ کی مدد کر کے وہ خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ کے ستر سے کچھ اوپر نمائندوں نے مکہ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت کیسے نازک حالات میں ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وفد کے ایک رکن کعب بن مالک انصاری کہتے ہیں کہ ہم مدینہ سے مکہ کے لئے اس طرح روانہ ہوئے کہ ہمارا قبیلہ جو حسب معمول زیارت کعبہ کے لئے جا رہا تھا اس کے ساتھ خاموشی سے حج کے نام پر شریک ہو گئے۔ مکہ کے قریب قبیلہ والوں نے پڑاؤ ڈالا۔ رات کے وقت ہم دوسروں کی طرح ان کے ساتھ سو گئے۔ یہاں تک کہ جب رات کا تہائی

حصہ گزر گیا تو ہم رسول اللہ کی قرار داد کے مطابق اپنے بستروں سے خاموشی کے ساتھ اٹھے، اور مقام موعود کی طرف اس طرح چلے جیسے چڑیا جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ چھپتی ہوئی چلتی ہے (تنسلل تسلل القطا مستخفین، سیرۃ ابن ہشام، جز ثانی، صفحہ ۴۹)

وہ لمحہ بھی کیسا عجیب تھا جب کہ ایک دنیا پیغمبر کو رد کر چکی تھی، اس وقت کچھ لوگ اس کو قبول کرنے کے لئے سبقت کر رہے تھے، یہ وہ وقت تھا کہ پیغمبر سے ان کا وطن چھینا جا چکا تھا۔ طائف سے انھیں پتھر مار کر بھگا دیا گیا تھا۔ تمام قبائل نے آپ کو پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں مدینہ کے لوگوں نے آپ کی صداقت کو پہچانا اور آپ کی پکار پر لبیک کہا۔ اس وقت جب کہ انصار مدینہ بیعت کے لئے بڑھے، ایک شخص نے اٹھ کر کہا، کیا تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ اپنے اموال اور اپنی اولاد کو ہلاک کرنے پر بیعت کرنا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ ہم علیٰ نھلکۃ الاموال والاولاد بیعت کر رہے ہیں پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم نے اس عہد بیعت کو آخر تک پورا کر دیا تو ہمارے لئے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جنت۔ انھوں نے کہا، اپنا ہاتھ لائیے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں ——

اپنے آپ کو اس طرح ایک متنازعہ صداقت کے حوالے کرنا، اپنا سب کچھ اس طرح ایک غیر قائم شدہ حق کو سونپ دینا اتنا انوکھا واقعہ ہے کہ وہ اجتماعی سطح پر تاریخ میں صرف ایک ہی بار پیش آیا ہے، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

غیر متعلق مسائل سے تعرض نہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو عرب میں وہ تمام مسائل پوری طرح موجود تھے جن کو موجودہ زمانہ میں قومی مسائل کہا جاتا ہے اور جن مسائل کے نام پر عام طور پر دنیا میں تحریکیں اٹھتی ہیں۔ یہ مسائل ذہین افراد کو متاثر کرتے ہیں اور وہ ان کا نعرہ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ تمام مسائل موجود تھے لیکن آپ نے ان سے مطلق تعرض نہیں کیا۔ اگر آپ ان مسائل میں الجھتے تو یہ خدا کے منصوبہ میں اپنے کو شامل کرنا نہ ہوتا۔ وہ سارے مواقع جو ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں پیدا کئے گئے تھے برباد ہو کر رہ جاتے۔

۱۔ حبش نے ۵۲۵ء میں عرب کے سرحدی علاقہ یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ ابرہہ اس زمانہ میں شاہ حبش کی طرف سے یمن کا گورنر تھا۔ ابرہہ کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال (۵۷۰ء) میں اس نے ہاتھیوں کی فوج سے مکہ پر حملہ کیا تاکہ کعبہ کو ڈھا دے اور مکہ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دے۔ ۵۰ سالہ قبضہ کے بعد یمن پر حبش کی حکومت ختم ہوئی اور اس پر شاہ فارس کی حکومت

قائم ہوگئی جس کی طرف سے باذان یمن کا گورنر مقرر ہوا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اور اس کی خبر کسریٰ (شاہ فارس) کو پہنچی تو اس نے باذان کو لکھا کہ اس آدمی کے پاس جاؤ جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس سے کہو کہ وہ اس دعوی سے باز آئے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیجو (والا فابعث الیّ براسہ، سیرۃ ابن ہشام)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں ظاہر ہوئے تو اس وقت عرب کی سرحدوں پر غیر ملکی قبضہ نے کیسے سنگین مسائل پیدا کر رکھے تھے۔ ان حالات میں ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ہم قوموں کو غیر ملکی قبضہ کے خلاف اکساتے اور اس کے خلاف جنگ چھیڑ دیتے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ خدا کے منصوبے سے انحراف کے ہم معنی ہوتا۔ کیونکہ خدا کا منصوبہ تو یہ تھا کہ لوگوں سے غیر متعلق امور پر ٹکراؤ نہ کیا جائے بلکہ خاموشی سے دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھا جائے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور تاریخ نے دیکھا کہ بالآخر خود باذان نے اسلام قبول کر لیا اور یمن کے عیسائی باشندوں کی اکثریت نے بھی ——— جو مقصد ایک قومی لیڈر ناکام طور پر سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا وہ آپ نے کامیاب طور پر دعوتی کارروائی کے ذریعہ حاصل کر لیا۔

۲۔ ابوطالب کی وفات کے بعد قبائلی رسم کے مطابق بنو ہاشم کا سردار ابولہب مقرر ہوا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حمایت میں لینے سے انکار کر دیا۔ اب آپ کو کسی دوسرے حمایتی قبیلہ کی ضرورت پیش آئی۔ آپ حمایتی کی تلاش میں مختلف قبائل کے پاس گئے۔ عرب کا ایک سرحدی قبیلہ بنو شیبان بن ثعلبہ تھا۔ آپ اس سے ملے تو قبیلہ کے سردار مثنیٰ بن حارثہ نے کہا کہ ہم کسریٰ (شاہ فارس) کی مملکت کے قریب رہتے ہیں۔ وہاں ہم ایک معاہدہ کے تحت مقیم ہیں جو کسریٰ نے ہم سے لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم کوئی نئی بات نہ کریں گے اور نہ کسی نئی بات کرنے والے کو پناہ دیں گے۔ اور شاید بادشاہوں کو وہ بات ناپسند ہو جس کی طرف آپ بلاتے ہیں (ان لا نحدث حدثا ولا نؤوی محدثا۔ ولعل ھذا الامر الذی تدعوا الیہ تکرھہ الملوک، سیرۃ ابن کثیر)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطراف عرب میں بیرونی سلطنتوں کے نفوذ نے جو مسائل پیدا کئے تھے وہ صرف سیاسی یا ملکی ہی نہ تھے بلکہ دعوت و تبلیغ کے معاملہ تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے ایسا نہیں کیا کہ یہ کہہ کر پہلے مرحلہ ہی میں ان سے لڑائی چھیڑ دیں کہ جب تک یہ خارجی رکاوٹیں دور نہ ہوں کوئی دعوتی کام نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ اول مرحلہ میں ان خارجی طاقتوں سے لڑ جاتے تو یہ خدائی منصوبہ کے خلاف ہوتا۔ کیونکہ خدائی منصوبہ تو یہ تھا کہ روم و فارس کو آپس میں بیس سال تک لڑا کر بالکل کمزور کر دیا

جائے اور پھر خود انھیں پر جارحیت کا الزام ڈال کر مسلمانوں کے لئے ان کو فتح کرنا آسان بنا دیا جائے۔ اگر مسلمان ابتدائی مرحلہ میں روم و فارس سے لڑ جاتے تو وہ نتیجہ بالکل برعکس صورت میں نکلتا جو بعد کے تصادم کے ذریعہ حیرت انگیز غیر ملکی فتوحات کی صورت میں برآمد ہوا۔

خدائی منصوبہ سے مطابقت

کسان کا معاملہ قدرت کے کاگ (دندانہ) میں اپنا کاگ دینے کا معاملہ ہے۔ خدا نے ہماری زمین پر فصل اگانے کے بہترین امکانات پیدا کئے ہیں۔ مگر ان امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لئے کسان کو ایک حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین کی سطح پر زرخیز مٹی (Soil) کی تہ رکھی گئی ہے جو معلوم کائنات میں کسی بھی دوسرے مقام پر نہیں۔ مگر تمام زرخیزی کے باوجود اس مٹی سے فصل اسی وقت اگتی ہے جب کہ اس میں نمی بھی ہو۔ اس نمی کے نہ ہونے کی وجہ سے خشک علاقوں کے صحرا چٹیل بیابان بن کر رہ گئے ہیں، اس حقیقت کو قدرت لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر کے نہیں بتاتی بلکہ خاموش اشارہ کی زبان میں بتاتی ہے۔ کسان کو اسے خاموش اشارہ کی زبان میں جاننا پڑتا ہے۔ چنانچہ کسان یہ کرتا ہے کہ وہ یا تو بارش سے نم ہونے والی زمین میں اپنی فصل بوتا ہے یا آب پاشی کے ذریعہ پہلے اس میں نمی پہنچاتا ہے، پھر اپنا دانہ اس میں ڈالتا ہے۔ یہی معاملہ داعی کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عرب میں اگرچہ بہترین حالات پیدا کر دئے گئے تھے اس کے باوجود ضروری تھا کہ آپ ربانی حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے کام کو آگے بڑھائیں۔ اگر آپ کا منصوبہ خدائی منصوبہ کی رعایت کے بغیر چلتا تو آپ کو کبھی وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو عملاً آپ کو حاصل ہوئی۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ دعوتی عمل میں ساری اہمیت مسئلۂ آخرت کو دی جائے۔ مسئلہ دنیا کو کسی بھی حال میں دعوت کا اشو نہ بنایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی مسئلہ انسان کا ابدی اور حقیقی مسئلہ ہے۔ دوسرے تمام مسائل وقتی اور اضافی مسئلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آخرت کے بغیر انسان کی کامیابی بھی اتنی ہی بے معنی ہے جتنی کہ اس کی ناکامی بے معنی۔

دوسری بات یہ کہ انسانی زندگی میں ہر قسم کی کامیابی کا تعلق افراد کے کردار سے ہے۔ اور انسان کے اندر حقیقی اور مستقل کردار صرف آخرت پر گہرے یقین ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ عقیدۂ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار نہیں ہے، بلکہ وہ ہر آن خدا کی پکڑ میں ہے۔ یہ عقیدہ آدمی سے بے راہ روی کا مزاج چھین لیتا ہے اور اس کو پابند اور ذمہ دار انسان بنا دیتا ہے ——— قرآن و حدیث کو اگر خالی الذہن ہو کر پڑھا جائے تو اس میں آخرت کا مسئلہ سب سے زیادہ ابھرا ہوا مسئلہ نظر آئے گا۔ دوسرے مسئلوں کا ذکر بھی اگرچہ آتا ہے مگر وہ ضمناً ہے نہ کہ اصلاً۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ داعی اور مدعو کے درمیان کسی بھی حال میں کوئی مادی جھگڑا نہ کھڑا کیا جائے۔ مدعو کو کسی بھی حال میں فریق نہ بننے دیا جائے، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس حکمت کی ایک نمایاں مثال حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔ قریش نے مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ کر یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کہ مسلم گروہ اور غیر مسلم گروہ دونوں ایک دوسرے کے جنگی فریق بن گئے تھے۔ تمام وقت جنگ کی باتوں اور جنگ کی تیاریوں میں گزرنے لگا تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ہر مطالبہ کو مانتے ہوئے ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ یہ معاہدہ اس قدر یک طرفہ تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے اس کو ذلت کا معاہدہ سمجھا، مگر خدا کے نزدیک وہ فتح مبین (الفتح ۱) کا دروازہ تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ جنگی مقابلہ آرائی کی فضا ختم ہوتی تھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے بعد جیسے ہی اہل عرب جنگی فریق کے بجائے مدعو کے مقام پر آئے، ان کے درمیان دعوت حق کی آواز پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ صرف دو سال میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دس گنا بڑھ گئی۔ جو مکہ جنگ سے فتح ہوتا نظر نہ آتا تھا وہ دعوتی عمل کے ذریعہ مسخر ہو گیا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مدعو پر قابو پانے کے باوجود اس کے ساتھ فراخی کا سلوک کیا جائے۔ اس معاملہ کی مثالیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد قریش کے تمام وہ لوگ پوری طرح آپ کے قابو میں تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ بدترین ظلم کئے تھے۔ مگر آپ نے ماضی کے جرائم کی بنیاد پر کسی کو سزا نہ دی۔ سب کو یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ قریش کے لوگ جب بندھے ہوئے آپ کے سامنے حاضر کئے گئے تو آپ نے فرمایا: اذھبوا فانتم الطلقاء (جاؤ تم سب آزاد ہو) کچھ لوگوں کے بارے میں آپ نے وقتی طور پر قتل کئے جانے کا حکم دے دیا۔ مگر اس کے بعد ان میں سے بھی ہر اس شخص کو معاف کر دیا گیا جب کہ اس نے یا اس کی طرف سے کسی نے آکر آپ سے جان بخشی کی درخواست کی۔ اس قسم کے سترہ نامزد آدمیوں میں سے صرف پانچ کو قتل کیا گیا جنھوں نے معافی نہیں مانگی تھی۔ احد کی جنگ میں وحشی بن حرب نے حضرت حمزہ کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد ہند بنت عتبہ نے آپ کی لاش کو لے کر اس کا مثلہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو وقتی طور پر آپ کی زبان سے نکل گیا کہ اگر اللہ نے مجھے ان کے اوپر فتح دی تو میں ان کے تین آدمیوں کا مثلہ کروں گا (لئن اظھرنی اللہ علیھم لأمثلن بثلاثین رجلا منھم، تفسیر ابن کثیر، جلد ثانی، صفحہ ۳۵۲) فتح مکہ کے بعد آپ نے جن سترہ آدمیوں کے قتل کا حکم دیا تھا ان میں وحشی اور ہند دونوں شامل تھے۔ مگر دونوں نے جب آپ کی خدمت میں آکر معافی مانگی تو دونوں کو معاف کر دیا گیا۔ کیونکہ یہی طریقہ منصوبۂ الٰہی کے مطابق تھا۔

یہ اصول بے حد اہم حکمت پر مبنی ہے۔ انسان پتھر نہیں ہے کہ ایک پتھر کو توڑ دیا جائے تو اس کے دوسرے قریبی پتھر توڑنے والے کے بارے میں کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں۔ انسان زندہ معاشرہ کا ایک زندہ جزء ہے۔ جب بھی ایک انسان پر جارحانہ کارروائی کی جاتی ہے تو اس کے قریبی لوگوں میں انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس طرح سماج میں تخریبی کارروائیاں جنم لیتی ہیں۔ فتح کے بعد جو وقت نئی تعمیر میں لگتا وہ تخریب کاروں کا مقابلہ کرنے میں صرف ہونے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد پچھلے مخالفین کو عمومی معافی دے کر آئندہ کے لئے ہر قسم کی تخریبی سرگرمیوں کا دروازہ بند کر دیا۔ مزید یہ کہ ان کی اکثریت اسلام قبول کر کے اسلام کی طاقت کا ذریعہ بن گئی، جیسے کہ عکرمہ ابن ابی جہل۔

۴۔ فتح و غلبہ حاصل کرنے کے بعد اجتماعی معاملات کی اصلاح کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلد بازی کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ صبر و تدریج کے ذریعہ اصلاحات کا نفاذ کیا۔

مکہ کے قریش دین ابراہیمی کے وارث تھے۔ مگر انھوں نے اصل دین ابراہیمی کو بگاڑ دیا اور اس میں بہت سی بدعتیں جاری کر دیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم نے حج کو قمری مہینوں کی بنیاد پر ذی الحجہ میں قائم کیا تھا۔ قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قمری مہینوں کی مطابقت موسموں کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حج کبھی ایک موسم میں آتا اور کبھی دوسرے موسم میں۔ یہ صورت قریش کے تجارتی مفاد کے خلاف تھی۔ انھوں نے حج کو ہمیشہ گرمی کے موسم میں رکھنے کے لئے نسیٔ (کبیسہ) کا طریقہ اختیار کر لیا۔ وہ قمری مہینوں میں ہر سال گیارہ دن بڑھا دیتے۔ اس طرح نام اگرچہ قمری مہینوں کا ہوتا مگر عملاً اس کا سال شمسی سال کے ساتھ چلتا۔ اس کی وجہ سے تاریخیں ۳۳ سال تک کے لئے بدل جاتیں، ایک بار مہینوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے بعد دوبارہ ۳۳ سال پر ایسا ہوتا کہ حج ابراہیمی طریقہ کے مطابق اصل ذی الحجہ میں پڑتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ وہ قریش کی بدعتوں کو ختم کر کے حج کو دوبارہ ابراہیمی طریقہ پر قائم کریں۔ فتح مکہ (رمضان ۸ھ) کے بعد آپ عرب کے حکمراں بن گئے۔ آپ ایسا کر سکتے تھے کہ نسیٔ کی بدعت کو فوری طور پر ختم کرنے کا اعلان کر دیں۔ مگر آپ نے صبر سے کام لیا۔ اس وقت نسیٔ کے ۳۳ سالہ دور کو پورا ہونے میں صرف دو سال باقی تھے۔ آپ نے دو سال انتظار فرمایا۔ مکہ کے فاتح ہونے کے باوجود دو سال آپ حج کے لئے نہیں گئے۔ آپ نے صرف تیسرے سال (۱۰ھ) حج کی عبادت میں شرکت کی جو کہ ۳۳ سالہ دور کو پورا کر کے ٹھیک ابراہیمی تاریخ پر ذی الحجہ میں ہو رہا تھا۔ اس وقت مشہور حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرما دیا کہ اس سال حج جس طرح ہو رہا ہے اسی طرح اب ہر سال ہوگا۔ اب نسیٔ کا اصول ہمیشہ کے لئے ختم کیا جاتا ہے۔ یہی بات ہے جو حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے ان الفاظ میں ادا فرمائی:

ایھا الناس ان الزمان قد استدار فھو الیوم کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض، وان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھراً

(ابن جریر وابن مردویہ)

اے لوگو زمانہ گھوم گیا۔ پس آج کے دن وہ اپنی اس ہیئت پر ہے جس دن کہ اللہ نے زمین وآسمان کو پیدا کیا تھا۔ اور مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک ۱۲ مہینے ہیں۔

اس تاخیر میں بہت گہری مصلحت تھی۔ کیونکہ مذہب میں جب کوئی طریقہ عرصہ تک رائج رہے تو وہ مقدس بن جاتا ہے۔ لوگوں کے لئے اس کے خلاف سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چونکہ دو سال بعد خود ہی حج ان تاریخوں پر آرہا تھا جو آپ چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے قبل از وقت اقدام کرکے غیر ضروری مسئلہ کھڑا کرنے سے پرہیز کیا۔ جب فطری رفتار سے حج اپنی اصل تاریخ پر آگیا تو آپ نے اعلان فرمادیا کہ یہی حج کی اصل تاریخ ہے اور آئندہ اب انھیں تاریخوں میں حج ہوتا رہے گا۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی پوری تحریک میں ربانی حکمت کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملایا، آپ نے خدائی منصوبہ سے موافقت کرتے ہوئے تمام کارروائیاں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کوششوں کے عظیم الشان نتائج برآمد ہوئے۔

دور جدید میں اسلامی دعوت

دین کی دعوت کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے۔ دوسرا، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد۔ آپ سے پہلے خدا کی جو کتابیں آئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان لوگوں پر ڈالی گئی تھی جن کی طرف وہ کتابیں بھیجی گئی تھیں۔ اس لئے ان کے بارے میں استحفاظ (حفاظت طلب کرنا) کا لفظ آیا ہے (بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانوا علیہ شھداء، مائدہ ۴۴) مگر قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ میں لے لی (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون، الحجر ۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ شرک کو مغلوب کریں اور توحید کو غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں رائج کر دیں (الانفال ۳۹) یہ کام صرف خدا کی نصرت سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا کئے جن کو استعمال کرکے آپ نے شرک کو مغلوب کیا اور توحید کو فکری غلبہ کے مقام پر پہنچایا۔

رسول اور اصحاب رسول کی کوششوں کے نتیجہ میں شرک ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اب

اس کی کوئی امید نہیں کہ شرک دوبارہ ایک غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں ابھر سکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں دوبارہ یہ واقعہ ہوا کہ توحید نے غالب فکر کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا۔ آج ساری دنیا میں الحاد کو غالب فکر کی حیثیت حاصل ہے۔ بے خدا ذہن یا سکولر طرز فکر آج دنیا کا غالب فکر ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا فکر عملاً دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام یہی ہے کہ ملحدانہ طرز فکر کو مغلوب کیا جائے تاکہ توحید اپنا غلبہ کا مقام دوبارہ حاصل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ آئندہ دور الحاد آنے والا ہے۔ اس لئے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی۔ پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے دوبارہ ایسے حالات پیدا کرنے شروع کئے جو بالآخر دعوت توحید کے لئے معاون بن سکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ گیا ہے۔ آج اگرچہ بظاہر الحاد کا فکری غلبہ ہے۔ مگر وہ حالات پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں جن کو استعمال کر کے دوبارہ توحید کو فکری غلبہ کا مقام دیا جا سکے۔

پہلے مرحلہ میں غلبۂ توحید کا کام دعوت کے بعد طاقت کے ذریعہ انجام پایا (قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ، البقرہ ۱۹۳، بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق، الانبیاء ۱۸) مگر دوسرے مرحلہ میں یہ کام تبیین و تبلیغ کے ذریعہ انجام پانا ہے، جیسا کہ قرآن کے اشارہ سے معلوم ہوتا ہے:

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق اولم یکف بربک انہ علیٰ کل شیئ شھید (حم سجدہ ۵۳)

ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے دنیا میں بھی اور ان کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ (قرآن) بالکل حق ہے۔ کیا تیرے رب کا ہر بات پر شاہد ہونا کافی نہیں

ذہنی انقلاب

موجودہ زمانہ میں ایک زبردست ذہنی انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب کیا ہے؟ اس کے لئے کوئی دوسرا موزوں لفظ نہ ہونے کی وجہ سے میں اس کو سائنسی انقلاب کہتا ہوں۔ جدید سائنسی انقلاب نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسی فکری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جو دعوت توحید کے عین موافق ہیں۔ ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو صرف قلمی و لسانی تبلیغ کے ذریعہ غلبہ توحید کا وہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے تلوار اٹھانی پڑی تھی۔

جدید سائنسی انقلاب دراصل صدر اول کے اسلامی انقلاب کا ایک ضمنی حاصل (By-product) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی انقلاب کے ذریعہ ایسے اسباب پیدا کئے جنھوں نے تاریخ کے اندر اپنا عمل شروع کیا۔

یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچا جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ گویا خدا نے صدر اول میں شرک کے اوپر توحید کو غلبہ دیا تو اسی کے اندر وہ اسباب بھی پیدا کر دئے جو بعد کے زمانہ میں الحاد پر توحید کو غالب کرنے میں مددگار بن سکیں۔

اسلام کے ذریعہ آنے والے توحیدی انقلاب سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ شرک دراصل مظاہر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو نمایاں نظر آئی اسی کو انسان نے پوجنا شروع کر دیا، خواہ وہ آسمان کا سورج ہو یا زمین کا بادشاہ۔ اس کی وجہ سے دور شرک میں سائنسی تحقیق کا کام ممکن نہ ہو سکا۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے الفاظ میں، فطرت کے مظاہر اس وقت پرستش کا موضوع (Object of Worship) بنے ہوئے تھے، پھر وہ تحقیق کا موضوع (Object of Investigation) کیسے بنتے۔ اسلام نے شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا تو ایک خدا کے سوا ہر چیز مخلوق نظر آنے لگی، اس انقلاب نے یہ ممکن بنا دیا کہ چیزوں پر تحقیق کا عمل جاری کیا جا سکے۔ یہ عمل ابتدائی صورت میں دور اول ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ایک بار چاند گرہن کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ وہ کسی بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کی بنا پر نہیں ہوتے۔ اس طرح آپ نے مادی بڑائی کی بھی نفی کر دی اور انسانی بڑائی کی بھی۔ یہ فکری لہر عقیدہ سے الگ ہو کر یورپ پہنچی اور بالآخر جدید انقلاب کا سبب بنی۔

۱۔ اس انقلاب کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ توہماتی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ توہم پرستی کیا ہے۔ توہم پرستی نام ہے حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے بجائے مفروضات و قیاسات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا۔ (مثلاً یہ فرض کر لینا کہ جب کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو سورج یا چاند گہنا جاتے ہیں) یہ ذہن اسلام کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا آدمی حقائق واقعی کی بنیاد پر اسلام اور غیر اسلام کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ پیشگی مفروضات کی بنیاد پر بلا دلیل ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط مان لیتا ہے۔ مثلاً اسلام تاریخی طور پر ایک مستند دین ہے اور دیگر تمام مذاہب تاریخی استناد سے محروم ہیں۔ مگر توہمات کے دور میں انسان اس کو اہمیت نہیں دے پاتا تھا۔ جدید دور نے اس کو پوری اہمیت کے ساتھ لیا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں تنقید عالیہ (Higher Criticism) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آگیا ہے۔ اس فن کے تحت یہ حقیقت پوری طرح مسلّم ہو گئی ہے کہ تاریخی طور پر معتبر دین صرف اسلام ہے۔ دوسرے ادیان کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔

۲۔ سائنسی ذہن نے کائنات کو تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کے

نتیجہ میں کائنات میں چھپے ہوئے ایسے فطری حقائق انسان کے علم میں آئے جو اسلام کی تعلیمات کی تصدیق اعلیٰ سطح پر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی تحقیق نے بتایا کہ کائنات میں ہر جگہ ایک ہی قانون فطرت کارفرما ہے۔ جو قانون زمین کے احوال پر حکمراں ہے وہی قانون کائنات کے دور دراز مقامات پر بھی حکمراں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک ہے۔ دو خدا یا بہت سے خداؤں کی اس کائنات میں گنجائش نہیں۔

۳۔ دین توحید کو قدیم زمانہ میں اختیار کرنے کے لئے، ایک علمی رکاوٹ، قدیم فلسفہ بھی تھا۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ کو غالب علم کا مقام حاصل تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے سوچنے کی ذہنی زمین اس زمانہ میں فلسفہ ہوتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دین توحید کی راہ میں ایک بہت بڑی مصنوعی رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔

قدیم فلسفہ کا آخری نشانہ ہمیشہ سے آخری سچائی کی تلاش رہا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال کی شاندار تاریخ کے باوجود فلسفہ اپنے نشانہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ انسان کی محدودیتوں (Limitations) کا ادراک نہ کر سکا۔ وہ آخری سچائی تک پہنچنے کے لئے ساری کوششیں صرف کرتا رہا۔ جب کہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے بطور خود آخری سچائی تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

اس فلسفیانہ طرز فکر کی وجہ سے ہزاروں برس تک انسان یہ چاہتا رہا کہ دین توحید کی بنیاد جن اساسی عقائد پر قائم ہے اس کو انسان کے لئے مکمل طور پر معلوم اور مشاہد بنا دیا جائے۔ مگر یہ تمام غیبی حقیقتیں تھیں اور انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ ان غیبی حقیقتوں کا کامل ادراک نہیں کر سکتا۔ جدید سائنس کا، ذہنی نقطۂ نظر سے، سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس مفروضہ کو ڈھا دیا۔ اس نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ وہ اپنی محدودیت کی وجہ سے حقیقت کا کلی ادراک نہیں کر سکتا۔ قدیم فلسفہ کی پیدا کردہ ذہنی زمین اب ساری دنیا میں دفائی حیثیت کے مقام پر جا چکی ہے اور اب سائنس کی دریافت کردہ ذہنی زمین کو علمی دنیا میں غالب مقام حاصل ہے۔

ذہن کی اس تبدیلی نے دین توحید کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب اس نقطۂ نظر کو، کم از کم بالواسطہ طور پر، مکمل علمی تائید حاصل ہے کہ انسان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حقیقت اعلیٰ کو پانے کے لئے وہ پیغمبر کی اطلاع کا اعتبار کرے۔ اب یہ مطالبہ سراسر غیر علمی مطالبہ بن چکا ہے کہ خدا اور وحی اور آخرت کو ہماری آنکھوں سے ہمیں دکھاؤ، اس کے بعد ہی ہم اس پر ایمان لائیں گے۔

معلوم تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ خود علم انسانی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا علم محدود ہے

اور ہمیشہ محدود رہے گا۔ انسان سائنسی ذرائع سے جب کائنات کی کھوج کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کائنات اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ انسان کا محدود ذہن اس کا احاطہ کر سکے۔ سائنس کی یہ دریافت اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس سے رسالت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ایک طرف انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقت کو آخری حد تک جان لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ایسی محدودیت کا شکار ہے کہ وہ کبھی بھی حقیقت کو آخری حد تک نہیں جان سکتا۔ انسانی زندگی کا یہ خلا واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کو ایک برتر رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی برتر رہنما کا دوسرا نام پیغمبر ہے۔ انسانی محدودیت کے بارے میں سائنس کے اقرار نے پیغمبر کی ضرورت کو خالص علمی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔

۴۔ قدیم زمانہ میں انسان کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس کی اصل وجہ بادشاہوں اور بڑے انسانوں کے تقدس کا عقیدہ تھا۔ جو لوگ کسی وجہ سے اونچے مقام پر پہنچ جاتے ان کو مقدس سمجھ لیا جاتا۔ ان کی رائے دوسروں سے برتر مانی جاتی۔ ان کو یہ حق مل جاتا کہ جس طرح چاہیں دوسروں کو اپنی مرضی کا پابند بنائیں۔ توحید کے انقلاب نے انسانی بڑائی کا خاتمہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت نہیں۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نئی فکری لہر چل پڑی۔ یہی وہ فکری لہر ہے جس کی سیاسی تکمیل بالآخر یورپ میں جمہوریت کی صورت میں ہوئی۔ جمہوری انقلاب نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرا دیا۔ ہر شخص کے لئے یہ فکری حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ اس انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنا دیا کہ خدا کے دین کی تبلیغ اس طرح کی جائے کہ تبلیغ کرنے والے کے لئے کسی طرح کی پکڑ دھکڑ کا اندیشہ نہ ہو۔

۵۔ سائنس نے آج کے انسان کے لئے خدا کی بہت سی وہ مادی نعمتیں کھولی ہیں جو ہزاروں برس سے کائنات کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں اسلامی دعوت کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم جدید ذرائع مواصلات ہیں۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسی طرح مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں۔ یہ چیزیں اسلام کے حق میں عظیم نعمتیں ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

یہ مواقع جو عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں، پچھلے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ اسلام کے غلبۂ اول کے حالات فراہم کئے، اسی طرح اس نے دوبارہ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں اسلام کے غلبۂ ثانی کے حالات فراہم کر دئے ہیں۔ تاہم یہ حالات و مواقع خود اپنے زور پر واقعہ نہیں بن جائیں گے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے زندہ

انسانوں کی ایک جماعت درکار ہے۔ ایسی ایک جماعت اگر کھڑی ہو جائے تو قریبی مستقبل میں اسی طرح دوبارہ اسلام کو فکری غلبہ مل سکتا ہے جس طرح قرن اول میں اس کو شرک کے مقابلہ میں فکری غلبہ حاصل ہوا تھا۔

اوپر جن امکانات کا ذکر ہوا وہ تقریباً ایک سو سال سے ایسی کسی جماعت کا انتظار کر رہے ہیں مگر بدقسمتی سے ایسی کوئی جماعت ابھی تک کھڑی نہ ہو سکی۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے سو سال کے اندر ہمارے یہاں بے شمار جماعتیں اور تحریکیں اٹھی ہیں، مگر یہ تحریکیں وقتی حالات، خصوصاً سیاسی حالات کے ردعمل کے طور پر اٹھیں نہ کہ اس ربانی شعور کے تحت جو پچھلے ہزار سال سے تاریخ کے اندر کام کرتا رہا ہے اور چودھویں صدی ہجری میں اپنی تکمیل کو پہنچا ہے۔

سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ بدر کے میدان میں جب طاقت ور اہل کفر بظاہر کمزور اہل ایمان کے اوپر ٹوٹ پڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدت احساس کے تحت سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ سے نصرت کی دعائیں مانگنے لگے۔ اس نازک لمحہ میں آپ کی زبان سے جو کلمات نکلے ان میں سے ایک جملہ یہ تھا: اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد بعد ھا فی الارض (خدایا اگر یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہو گی)۔ یہ کوئی مبالغہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین سو تیرہ روحیں جو بے سروسامانی کے باوجود بدر کے معرکہ میں کھڑی ہوئی تھیں یہ محض عام قسم کے تین سو تیرہ لوگ نہ تھے۔ یہ عصابہ دراصل وہ گروہ تھا جس پر ڈھائی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی تھی۔ اسی طرح آج دوبارہ ایک نیا عصابہ (گروہ) درکار ہے جس پر پچھلی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی ہو۔ جو اپنے شعور کے اعتبار سے پچھلی ہزار سالہ تاریخ کا وارث ہو۔ جو اپنے کردار کے اعتبار سے ان امکانات کو واقعہ بنانے کا اٹل ارادہ اپنے اندر لئے ہوئے ہو، جو سنجیدہ فیصلے کی اس حد پر پہنچا ہوا ہو جہاں پہنچ کر آدمی اس قابل ہو جاتا کہ وہ اپنے مقصد سے پوری طرح وابستہ رہے۔ کوئی بھی خارجی واقعہ اس کو اس کے نشانہ سے ہٹانے والا ثابت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملائیں گے۔ اور بالآخر یقینی کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے

اصحاب رسول

قرآن میں لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا ہے :

فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اھتدوا وان تولوا فانما ھم فی شقاق (البقرہ ۱۳۷) اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت یاب ہوئے اور اگر وہ منھ موڑیں تو وہ اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب رسول نہ صرف اول الایمان ہیں بلکہ وہی ہمیشہ کے لئے حق کا نمونہ بھی ہیں۔ خدا کے یہاں جو ایمان معتبر ہے وہ وہی ایمان ہے جو صحابہ کرام جیسا ایمان ہو۔ دین و ایمان کی کوئی ایسی قسم جو صحابۂ کرام کے دین و ایمان سے مختلف ہو، اللہ تعالیٰ کو مطلوب نہیں۔

یہاں صحابۂ کرام کی چند خصوصیات مختصراً درج کی جاتی ہیں

دین ان کے لئے محبوب چیز بن گیا تھا

اصحاب رسول کی خصوصیت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ ایمان ان کے لئے ایک محبوب شئے بن گیا تھا (الحجرات ۷) محبت کسی چیز سے تعلق کا آخری درجہ ہے۔ اور جب کسی چیز سے محبت کے درجہ کا تعلق پیدا ہو جائے تو وہ آدمی کے لئے ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کا ذہن اس چیز کے بارے میں اس طرح متحرک ہو جاتا ہے کہ آدمی بغیر بتائے ہوئے اس سے متعلق ہر بات کو جان لیتا ہے۔ اس کو خواہ معروف معنوں میں کوئی نقشہ کار نہ دیا گیا ہو مگر اس کا ذہن خود بتا دیتا ہے کہ اس کو اپنی محبوب شئے کے لئے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے (التوبہ ۴۶)

محبت کی سطح کے تعلق کا مطلب ہے دل چسپی کی سطح کا تعلق۔ یعنی یہ کہ آدمی اسلام کے نفع نقصان کو خود اپنا نفع نقصان سمجھنے لگے۔ اصحاب رسول کو اسلام سے اسی قسم کا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اسلام کے فائدے سے اسی طرح خوش ہوتے تھے جس طرح کوئی شخص اپنے بیٹے کی کامیابی سے خوش ہوتا ہے۔ اسلام کو کوئی نقصان پہنچے تو وہ اسی طرح بے چین ہو جاتے تھے جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے کے متعلق ناخوش گوار خبر سن کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس وقت تک اسے چین نہیں آتا جب تک وہ اس کی تلافی نہ کر لے۔

کسی چیز سے محبت کے درجے کا تعلق پیدا ہو جائے تو آدمی کا ذہن اس کے بارے میں پوری طرح

جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اس کی خاطر ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اور تقاضوں کو وہ بتائے بغیر جان لیتا ہے۔ اس کی بات کو پانے کے لئے کوئی نفسیاتی گرہ اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس کے راستے میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے وہ کسی چیز کو عذر نہیں بناتا۔

جب آدمی کسی معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھ لے تو اس کے بعد اس کو نہ زیادہ بتانے کی ضرورت ہوتی اور نہ زیادہ سمجھانے کی۔ اس کا قلبی تعلق اس کے لئے ہر دوسری چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ وہ کسی معاوضہ کی امید کے بغیر یک طرفہ طور پر اپنا سب کچھ اس کے لئے لٹا دیتا ہے۔ اس کی خاطر کھونا بھی اس کو پانا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خاطر بے قیمت ہو جانا اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر دوسری مصلحت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر تکلیف کو اس طرح سہہ لیتا ہے جیسے کہ وہ کوئی تکلیف ہی نہ ہو۔

اصحاب رسول کوئی غیر معمولی انسان نہ تھے۔ وہ کوئی ماورائے بشر مخلوق نہیں تھے۔ ان کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ "محبت" کے درجہ کا تعلق جو عام انسانوں کو صرف اپنے آپ سے ہوتا ہے وہی تعلق ان کو دین و ایمان سے ہو گیا تھا۔ عام آدمی اپنے مستقبل کی تعمیر کو جو اہمیت دیتا ہے وہی اہمیت وہ اسلام کے مستقبل کی تعمیر کو دینے لگے تھے۔ وہ دین کے لئے اپنا حصہ ادا کرنے کو اتنا ہی ضروری سمجھنے لگے تھے جتنا کوئی شخص اپنی ذاتی دل چسپی کے معاملہ میں اپنے آپ کو اور اپنے اثاثہ کو استعمال کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ ان کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ تاریخ کے وہ گروہ بنے جس نے اسلام کو عظیم ترین کامیابی کے مقام تک پہنچایا۔

پیغمبر کو آغاز تاریخ میں پہچاننا

صحابہ کی یہ انوکھی صفت تھی کہ انھوں نے اپنے ایک معاصر رسول کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا۔ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ معلوم تاریخ میں جماعت کی سطح پر صرف ایک بار پیش آیا ہے۔ قدیم تاریخ کے ہر دور میں یہ قصہ پیش آیا کہ رسولوں کے مخاطبین نے ان کا انکار کیا اور ان کا مذاق اڑایا۔ بائبل میں ہے کہ "تم نے میرے نبیوں کو ناچیز جانا" یہ نبیوں کو ناچیز جاننے والے کون لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو وحی و رسالت کو مانتے تھے۔ نبیوں کے نام پر ان کے یہاں ادارے قائم تھے اور بڑے بڑے جشن ہوتے تھے۔ مگر یہ سب کچھ قدیم نبیوں کے نام پر ہوتا تھا۔ جہاں تک وقت کے نبی کا سوال تھا، اس کے لئے ان کے پاس استہزار و تمسخر کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہود نے حضرت مسیح کا انکار کیا، حالانکہ وہ موسیٰ کو مانتے تھے۔ نصاریٰ نے حضرت محمد کا انکار کیا، حالانکہ وہ حضرت مسیح کی پرستش کی حد تک عزت کرتے تھے۔ اسی طرح قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر مارے اور آپ کو گھر سے نکالا، حالانکہ وہ حضرت ابراہیم کے وارث ہونے پر فخر کرتے تھے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم نبی کی نبوت تاریخی روایات کے نتیجہ میں ثابت شدہ نبوت بن جاتی ہے۔ وہ کسی قوم کے قومی اثاثہ کا ایک لازمی جزء ہوتی ہے۔ کسی قوم میں آنے والا نبی اس کی بعد کی نسلوں کے لئے ایک طرح کا مقدس ہیرو بن جاتا ہے۔ اس کو ماننا اپنے قومی تشخص کو قائم کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نبی کو کون نہیں مانے گا۔ مگر وقت کے نبی کی نبوت ایک متنازعہ نبوت ہوتی ہے۔ وہ التباس کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو ماننے کے لئے ظواہر کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کا ساتھ دینے کے لئے اپنی انا کو دفن کرنا ہوتا ہے۔ اس کے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ایک ایسے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ہوتا ہے جس کا برسرحق ہونا ابھی اختلافی ہو، جس کے بارے میں تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہ ہوئی ہوں۔ صحابہ کرام وہ لوگ تھے جنھوں نے معاصر رسول کو اس طرح مانا جس طرح کوئی شخص تاریخی رسول کو مانتا ہے۔

غزوۂ خندق میں جب محاصرہ شدید ہوا اور معمولی ضروریات کی فراہمی ناممکن ہوگئی تو ایک مسلمان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ محمد ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانے حاصل کریں گے اور اب یہ حال ہے کہ ہمارا ایک شخص بیت الخلا جانے کے لئے بھی محفوظ نہیں (کان محمد یعدنا ان ناکل کنوز کسریٰ وقیصر واحدنا لا یأمن ان یذھب الی الغائط، سیرۃ ابن ہشام جزء ثانی صفحہ ۲۱۴) غزوۂ خندق کے وقت رسول اللہ کا وعدہ محض ایک لفظی وعدہ تھا، آج یہ ایک تاریخی واقعہ بن چکا ہے۔ صحابہ نے اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے سے پہلے رسول کی عظمت کو مانا۔ ہم آج اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے کے بعد رسول کی عظمت کو مان رہے ہیں۔ دونوں ماننے میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔ آج ایک غیر مسلم محقق بھی پیغمبر اسلام کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان کہنے پر مجبور ہے مگر آپ کی زندگی میں آپ کی عظمت کو پہچاننا اتنا مشکل تھا کہ صرف وہی لوگ اس کو پہچان سکتے تھے جن کو خدا کی طرف سے خصوصی توفیق ملی ہو۔

قرآن کو دور نزاع میں اپنانا

سیرت کی کتابوں میں صحابہ کا دعوتی طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے نازل شدہ حصہ کو لے لیتے اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سناتے تھے (فعرض علیھم الاسلام وتلا علیھم القرآن) چنانچہ مدینہ میں جو صحابہ تبلیغ کے لئے گئے ان کو وہاں مقری (قرآن پڑھنے والا) کہا جاتا تھا۔ یہ بات آج کے ماحول میں بظاہر انوکھی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اگر چودہ سو سال کی تاریخ کو حذف کر کے آپ اسلام کے ابتدائی دور میں پہنچ جائیں اور اس وقت کے حالات میں اسے دیکھیں تو یہ اتنا انوکھا واقعہ معلوم ہوگا کہ نہ اس سے پہلے وہ کبھی جماعتی سطح پر پیش آیا اور نہ اس کے بعد۔

آج جب ہم لفظ "قرآن" بولتے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسی عظیم کتاب کا نام ہوتا ہے جس نے چودہ صدیوں میں اپنی عظمت کو اس طرح مسلم کیا ہے کہ آج کروروں انسان اس کو خدا کی کتاب ماننے پر مجبور ہیں۔ آج اپنے آپ کو قرآن سے منسوب کرنا کسی آدمی کے لئے فخر و اعزاز کی بات بن چکی ہے۔ مگر زمانۂ نزول میں لوگوں کے نزدیک اس کی یہ حیثیت نہ تھی۔ عرب میں بہت سے لوگ تھے جو یہ کہتے تھے کہ محمد نے پرانے زمانہ کے قصے کہانیوں کو جوڑ کر ایک کتاب بنالی ہے۔ ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی ایک کتاب بنالیں (لو نشاء لقلنا مثل هذا ان هذا الا اساطیر الاولین، الانفال ۳۱) کوئی قرآن میں تکرار کو دیکھ کر کہتا کہ یہ کوئی خاص کتاب نہیں۔ محمد کے پاس بس چند باتیں ہیں، انھیں کو وہ صبح شام دہراتے رہتے ہیں (وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملی علیه بکرة واصیلا، الفرقان ۵)

ایسی حالت میں قرآن کو پہچاننا گویا مستقبل میں ظاہر ہونے والے واقعہ کو حال میں دیکھنا تھا۔ یہ ایک چھپی ہوئی حقیقت کو اس کے ثابت شدہ بننے سے پہلے پالینا تھا۔ پھر ایسے وقت میں قرآن کو کتاب دعوت بنالینا اور بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس کے لئے اپنی عظمت کو کھو کر دوسرے کی عظمت میں گم ہونا پڑتا ہے۔ یہ اپنے مقابلہ میں دوسری شخصیت کا اعتراف کرنا ہے، اور وہ بھی ایسی شخصیت کا جس کی حیثیت ابھی مسلّم نہ ہوئی ہو۔ عرب کے مشہور شاعر لبید نے اسلام قبول کیا اور شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ تم نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ لبید نے کہا: ابعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی) آج کوئی آدمی شاعری چھوڑ کر یہ جملہ کہے تو اس کو زبردست عظمت اور مقبولیت حاصل ہوگی۔ مگر لبید کے قول میں اور آج کے شاعر کے قول میں کوئی نسبت نہیں۔ کیونکہ آج کا شاعر تاریخ کے اختتام پر یہ جملہ کہہ رہا ہے جب کہ لبید نے تاریخ کے آغاز پر یہ جملہ کہا تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئك اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا الحدید ۱۰	تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔

غیر قائم شدہ صداقت کے لئے مال لٹانا

ابن ابی حاتم نے ایک صحابی کا واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

عن عبد اللہ بن مسعود قال لما نزلت هذه الآیة (من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفه	عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قرآن میں یہ آیت اتری کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے

له الحديد ۱۱) قال ابوالدحداح الانصاری یارسول الله وانّ الله لیرید منا القرض قال نعم یا ابا الدحداح۔ قال ارنی یدك یارسول الله۔ قال فناوله یده۔ قال فانی قد اقرضت ربی حائطی۔ وله حائط فیه ستمائة نخلة وام الدحداح فیه وعیالها۔ قال فجاء ابوالدحداح فناداها یا امّ الدحداح قالت لبیك۔ قال اخرجی فقد اقرضته ربی عزوجل فقالت له ربح بیعك یا ابا الدحداح و نقلت منه متاعها و صبیانها۔ وانّ رسول الله صلی الله علیه قال کم من عذق رداح فی الجنة لابی الدحداح

(تفسیر ابن کثیر)

تو حضرت ابو دحداح انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے خدا کے رسول، کیا اللہ واقعی ہم سے قرض چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں اے ابو دحداح۔ انھوں نے کہا اے خدا کے رسول، اپنا ہاتھ لائیے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا۔ ابو دحداح نے کہا کہ میں نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ ان کا ایک کھجوروں کا باغ تھا جس میں چھ سو درخت تھے۔ اس وقت ان کی بیوی ام دحداح اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں تھیں۔ وہ باغ میں واپس آئے اور آواز دی کہ اے ام دحداح۔ انھوں نے کہا ہاں۔ ابو دحداح نے کہا باغ سے نکلو، کیونکہ اس کو میں نے اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ بیوی نے کہا: اے ابو دحداح آپ کی تجارت کامیاب رہی۔ اور اس کے بعد اپنے سامان اور اپنے بچوں کو لے کر باغ سے نکل آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو دحداح کے لئے جنت میں کتنے ہی شاداب اور پھل دار درخت ہیں۔

یہ ایک نمائندہ واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام جس دین پر ایمان لائے تھے اس دین کی خاطر قربانی پیش کرنے کے لئے وہ کس قدر بے چین رہتے تھے۔ یہاں دوبارہ ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ واقعہ چودہ سو سال پہلے کا ہے۔ آج کوئی شخص دین کے نام پر اس قسم کا انفاق کرے تو عین ممکن ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کے درمیان مقبولیت کی صورت میں اس کو بہت جلد اپنے انفاق سے زیادہ بڑی چیز مل جائے۔ مگر اصحاب رسول کے زمانے میں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس وقت دین کی راہ میں اپنا مال لٹانا ماحول میں دیوانگی کا خطاب پانے کا ذریعہ تھا، وہ اونچے میناروں پر نمایاں ہونے کے بجائے بنیاد کی زمین میں دفن ہونے کے ہم معنی تھا۔ اس وقت ایسا اقدام ایک ایسی تحریک کے خانہ میں لکھا جانے والا تھا جس کی صداقت ابھی مشتبہ تھی، جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ یہ ایک غیر مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرنا تھا، جب کہ آج کا آدمی ایک مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرتا ہے۔

اپنا تاج دوسرے کے سر پر رکھنا

مدینہ میں عبداللہ بن ابی بہت عاقل اور صاحب شخصیت آدمی تھا، وہ مدینہ کا سب سے زیادہ ممتاز سردار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مدینہ کے باشندوں کو اپنا اختلاف و انتشار ختم کرنے کا احساس ہوا تو انھوں نے عبداللہ بن ابی کو منتخب کیا کہ اس کو اپنا بادشاہ بنائیں اور اس کی علامت کے طور پر اس کو ایک تاج پہنائیں (فاما عبد اللہ بن ابی فکان قومہ قد نظموا لہ الخرز لیتوجوہ ثم یملکوہ علیہم، سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۱۶)

عبداللہ بن ابی کی تاج پوشی کا انتظام مکمل ہو چکا تھا کہ عین اس وقت اسلام مدینہ میں پہنچ گیا۔ مدینہ کے باشندوں کی فطرت نے اس کی صداقت کی گواہی دی اور اسلام گھر گھر میں پھیلنے لگا۔ اس کے بعد مدینہ کے باشندوں کا ایک نمائندہ وفد مکہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کی زبان سے آپ کا پیغام سنا۔ انھیں نظر آیا کہ مدینہ کی اجتماعی تنظیم کے لئے انھیں جو شخصیت درکار ہے وہ زیادہ بہتر طور پر محمد بن عبداللہ کی صورت میں موجود ہے۔ انھوں نے مدینہ کے لوگوں کی طرف سے آپ کو پیش کش کی کہ آپ مدینہ آئیں اور وہاں ہمارے سردار بن کر رہیں۔ اسلامی تاریخ کا یہی وہ واقعہ ہے جو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ اپنا تاج دوسرے آدمی کے سر پر رکھ دینے کے ہم معنی تھا۔ قدیم قبائلی دور میں ایسا کوئی واقعہ بے حد نادر واقعہ تھا۔ اپنی قوم یا قبیلہ سے باہر کسی آدمی کو اپنا غیر مشروط سردار بنا لینا ہمیشہ انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے اور قدیم زمانہ میں تو یہ اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ مزید یہ کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت "محمد" اس پر عظمت ہستی کا نام نہ تھا جس سے ہم آج واقف ہیں۔ اس وقت محمد ایک ایسے انسان تھے جن کو ان کے اہل وطن نے نکال دیا تھا۔ جن کے ساتھ قومی عصبیت اور تاریخی عظمت شامل نہ ہوئی تھی۔ جو نہ صرف متنازعہ شخصیت تھے بلکہ ایک لٹے ہوئے بے گھر انسان تھے۔ جن کو اپنا سب کچھ دے دینا تھا اور ان سے پانا کچھ بھی نہ تھا ——— بیسویں صدی میں کسی برنارڈ شا کے لئے بہت آسان ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے لئے یورپ کی سرداری کی پیش کش کرے۔ مگر چھٹی صدی عیسوی میں کسی کے لئے اس کا تصور بھی ناممکن تھا کہ وہ آپ کو پیغمبر مان کر آپ کو اپنا اجتماعی امام بنا لے۔

اپنی محدودیت کو جاننا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا تو آپ اس کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کرتے۔ آپ اپنے اصحاب کو جمع کرتے اور معاملہ کو بیان کر کے فرماتے کہ اشیروا علیّ ایہا الناس

(اے لوگو مجھے مشورہ دو) آپ بظاہر سب سے مشورہ طلب کرتے۔ مگر عملاً یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی رہتی اور اس کے بعد حضرت ابوبکر کھڑے ہو کر مختصراً اپنی رائے ظاہر کر کے بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصراً کچھ بول کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد معمولی طور پر کچھ لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ آپ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آیا تو آپ بھی اسی طرح لوگوں کو جمع کر کے مشورہ طلب کرتے، اب یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصر طور پر اپنی رائے ظاہر کر کے بیٹھ جاتے، اس کے بعد چند لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ حضرت عمر کے بعد غیر اصحاب کی تعداد بڑھ گئی اور مذکورہ صورت باقی نہ رہی۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے مگر یہ اتنی اہم بات ہے کہ تاریخ میں کوئی دوسرا معاشرہ نہیں پایا جاتا جس نے اس کا ثبوت دیا ہو۔ یہ طرز عمل صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اتنا خود شناس ہو جائے کہ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کو جاننے لگے۔ وہ دوسرے کے "ہے" کے مقابلہ میں اپنے "نہیں" سے واقف ہو جائے۔ وہ اپنے کو اس حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنے لگے جس نظر سے دوسرا شخص اسے دیکھ رہا ہے۔

اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ یہ واقعہ جس ابوبکر و عمر کے ساتھ پیش آیا وہ ابوبکر و عمر وہ نہ تھے جن کو آج ہم جانتے ہیں، آج ہم تکمیل تاریخ والے ابوبکر و عمر کو جانتے ہیں۔ مگر وہ آغاز تاریخ والے ابوبکر و عمر کو جانتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے معاصرین کے لئے صرف ان میں سے ایک تھے۔ جب کہ آج وہ ہمارے لئے گزری ہوئی تاریخ کے ستون ہیں جن کو ہم اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی ثابت شدہ واقعہ کو دیکھتا ہے۔ "ابوبکر و عمر" کو تاریخ بننے کے بعد جاننا انتہائی آسان ہے۔ لیکن "ابوبکر و عمر" کو تاریخ بننے سے پہلے جاننا اتنا ہی مشکل ہے۔ اصحاب رسول وہ لوگ تھے جو اس مشکل ترین معیار پر پورے اترے۔

ذمہ داری کو اپنے اوپر لے لینا

غزوۂ ذات السلاسل کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً ایک دستہ حضرت عمرو بن العاص کی سرداری میں بھیجا۔ یہ جگہ شام کے اطراف میں تھی۔ حضرت عمرو بن العاص نے وہاں پہنچ کر دشمن کی تیاریوں کا حال معلوم کیا تو اپنا دستہ انھیں اس کے لئے ناکافی معلوم ہوا۔ انھوں نے ایک مقام پر ٹھہر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ موجودہ فوج ناکافی ہے، مزید کمک روانہ کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین میں سے دو سو آدمیوں کا دستہ تیار کیا اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی سرکردگی میں اس کو روانہ فرمایا۔

حضرت ابوعبیدہ جب اپنے دستہ کو لے کر منزل پر پہنچے اور دونوں دستے ساتھ ہو گئے تو یہ سوال پیدا

ہوا کہ دونوں دستوں کا امیر کون ہو۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ دوسرا دستہ میری مدد کے لئے بھیجا گیا ہے اس لئے اصلاً میں ہی دونوں کا امیر ہوں۔ حضرت ابوعبیدہ کے ساتھی اس سے متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یا تو ابوعبیدہ دونوں دستوں کے مشترک امیر ہوں یا دونوں دستوں کا امیر الگ الگ رہے۔ جب اختلاف بڑھا تو ابوعبیدہ بن الجراح نے کہا: اے عمرو، جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے جو آخری عہد لیا وہ یہ تھا کہ آپ نے کہا کہ جب تم اپنے ساتھی سے ملو تو ایک دوسرے کی بات ماننا اور اختلاف نہ کرنا۔ اس لئے خدا کی قسم اگر تم میری نافرمانی کرو گے تب بھی میں تمہاری اطاعت کروں گا (تعلم یا عمرو ان آخر ما عهد الیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قال: اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا۔ وانك واللہ ان عصیتنی لاطعتك، رواہ البیہقی وابن عساکر)

حضرت ابوعبیدہ کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ ذمہ داری کو عمرو بن العاص پر ڈال کر ان سے لامتناہی بحث کرتے رہیں۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو وہ بہت سے ایسے الفاظ پا سکتے تھے جن میں ان کا اپنا وجود بالکل درست اور دوسرے کا وجود بالکل باطل دکھائی دے۔ مگر اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ ساری ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی۔ انھوں نے مسئلہ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا۔ اجتماعی زندگی میں یہ چیز بے حد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی اجتماعی زندگی چلتی ہی اس وقت ہے جب کہ اس کے افراد میں اتنی بلندی ہو کہ وہ حقوق کی بحث میں پڑے بغیر اپنے اوپر ذمہ داری لینے کی جرأت رکھتے ہوں۔ جہاں یہ مزاج نہ ہو وہاں صرف آپس کا اختلاف جنم لیتا ہے نہ کہ آپس کا اتحاد۔

شکایات سے اوپر اٹھ کر سوچنا

خالد بن الولید بے حد بہادر تھے۔ ان کے اندر غیر معمولی فوجی قابلیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر حضرت ابوبکر کی خلافت تک وہ مسلسل اسلامی فوج کے سردار رہے۔ تاہم حضرت عمر کو ان کی بعض عادتیں پسند نہ تھیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ ان کو سرداری کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکر نے ان کے مشورہ کو نہیں مانا۔ مگر حضرت عمر کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے حضرت خالد کو سرداری سے معزول کر کے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت دے دی۔

اس وقت حضرت خالد شام کے علاقہ میں فتوحات کے کارنامے دکھا رہے تھے۔ عین اس وقت خلیفہ ثانی نے انھیں معزول کر کے ابوعبیدہ بن الجراح کو ان کے اوپر سردار لشکر بنا دیا۔ اس کے بعد فوجیوں کی ایک تعداد خالد بن ولید کے خیمہ میں جمع ہوئی اور ان سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ خلیفہ کا حکم نہ مانیے۔ مگر حضرت خالد نے سب کو رخصت کر دیا اور کہا کہ میں عمر کے لئے نہیں لڑتا بلکہ عمر کے رب کے لئے لڑتا ہوں (انی لا اقاتل

فی سبیل عمر ولکن اقاتل فی سبیل رب عمر) وہ پہلے سردار لشکر کی حیثیت سے لڑتے تھے اور اب ایک ماتحت فوجی کی حیثیت سے لڑنے لگے۔

اس قسم کا کردار اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اتنا اونچا ہو جائے کہ وہ شکایتوں اور تلخیوں سے اوپر اٹھ کر سوچے اس کا رویہ ردعمل کے طور پر نہ بنے بلکہ مثبت فکر کے تحت بنے۔ وہ اللہ میں جینے والا ہو نہ کہ انسانی باتوں میں جینے والا۔

قانونی حد سے آگے بڑھ کر ساتھ دینا

شعبان ۲ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ قریش کے تمام سرداروں کی رہنمائی میں ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔ اس میں چھ سو زرہ پوش تھے اور اسی کے ساتھ ایک سو سواروں کا خصوصی دستہ بھی شامل تھا۔ یہ ایک بہت نازک وقت تھا۔ آپ نے مدینہ کے انصار اور مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے یہ سوال رکھا کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے، حسب معمول اولاً مہاجرین کے ممتاز افراد اٹھے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ کا رب جس بات کا حکم دے رہا ہے اس کی طرف بڑھئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم یہود کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ تم اور تمھارا خدا جا کر لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ آپ اور آپ کا خدا چل کر لڑیں، ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے ہم آپ کا ساتھ چھوڑنے والے نہیں۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کی اس قسم کی تقریروں کے باوجود بار بار یہ فرما رہے تھے کہ لوگو مجھے مشورہ دو (اشیروا علیّ ایھا الناس) چنانچہ سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، شاید آپ کا رخ ہماری طرف ہے۔ آپ نے کہا، ہاں، اس پر سعد بن معاذ نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا: ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی، اور اس بات کی گواہی دی کہ جو کچھ آپ لائے ہیں، وہ حق ہے، اور اس پر آپ سے سمع وطاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں، پس اے خدا کے رسول، آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کو کر گزریئے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں لے کر سمندر کے سامنے جا پہنچیں اور اس میں گھس جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں گھس جائیں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو ہرگز یہ ناگوار نہیں ہے کہ آپ ہمیں لے کر کل کے دن دشمن سے ٹکرا جائیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ مقابلہ کے وقت سچے اترنے والے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہم کو لے کر چلیں۔ (سیرت ابن ہشام)

انصار کے قائد کی اس تقریر کے بعد اقدام کا فیصلہ کر لیا گیا۔

بدر کی جنگ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار انصار کی طرف رخ کرنا بے سبب نہ تھا۔ اس کا ایک خاص پس منظر تھا۔ ابن ہشام اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وذلك أنهم حين بايعوه بالعقبة قالوا: يارسول الله، إنا برآء من ذمامك حتى تصل إلى ديارنا، فإذا وصلت إلينا فأنت في ذمتنا نمنعك مما نمنع منه أبناءنا ونساءنا، فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخوف ألا تكون الأنصار ترى عليها نصره إلا ممن دهمه بالمدينة من عدوه، وأن ليس عليهم أن يسير بهم إلى عدو من بلادهم، (سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۲۵۳)

اور ایسا اس لئے ہوا کہ انصار نے جب عقبہ میں بیعت کی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ کی ذمہ داری سے بری ہیں یہاں تک کہ آپ ہمارے دیس میں پہنچ جائیں۔ جب آپ ہمارے پاس آجائیں گے تو آپ ہماری ذمہ داری میں ہوں گے اور ہم آپ کا دفاع کریں گے جس طرح ہم اپنے لڑکوں اور عورتوں کا دفاع کرتے ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ تھا کہ انصار کہیں یہ سمجھتے ہوں کہ ان پر آپ کی مدد کرنا اس وقت ہے جب کہ آپ کا دشمن مدینہ پہنچ کر حملہ کرے۔ ان پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنی بستی سے دور جاکر مقابلہ کریں۔

انصار کی بیعت قدیم عربی اصطلاح کے مطابق بیعت نساء (دفاعی بیعت) تھی۔ اس کے مطابق مدینہ سے ۸۰ میل دور بدر کے مقام پر جاکر لڑنا ان کے لئے ضروری نہ تھا۔ مگر انصار نے اس کو اپنے لئے عذر نہیں بنایا۔ وہ قانونی حد کو توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور بدر کے میدان میں جاکر قربانی پیش کی۔

اختلاف سے بچ کر اصل نشانہ پر لگے رہنا

أخرج الطبراني عن المسور بن مخرمة قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم على أصحابه فقال إن الله بعثني رحمة للناس كافة فأدوا عني رحمكم الله، ولا تختلفوا كما اختلف الحواريون على عيسى بن مريم فإنه دعاهم إلى مثل ما أدعوكم إليه فأما من بعد مكانه فكرهه فشكا عيسى بن مريم ذلك إلى الله عز وجل ۔۔۔ فقال أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم نحن يا رسول الله نؤدي إليك فابعثنا حيث شئت

مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے سامنے تقریر کی اور فرمایا کہ اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ پس تم میری طرف سے اس ذمہ داری کو ادا کرو۔ خدا تم پر رحم کرے۔ اور تم لوگ اختلاف نہ کرنا جس طرح عیسیٰ بن مریم کے حواریوں نے اختلاف کیا۔ انھوں نے اپنے حواریوں کو اسی چیز کے لئے پکارا جس کی طرف میں تم کو پکار رہا ہوں۔ پس جس کا مقام دور تھا اس کو وہاں جانا ناگوار ہوا۔ تو عیسیٰ بن مریم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا کہ اے خدا کے رسول ہم آپ کی ذمہ داری کو ادا کریں گے۔ آپ ہم کو بھیجئے جہاں آپ چاہیں۔

اجتماعی کام میں رکاوٹ ڈالنے والی سب سے بڑی چیز اختلاف ہے۔ مگر صحابہ کرام کو اللہ کے خوف نے اتنا بے نفس بنا دیا تھا کہ وہ اختلافات سے بلند ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ کے زمانے میں انھوں نے عرب میں اور اطراف عرب میں آپ کی منشا کے مطابق اسلام کی دعوت پوری طرح پہنچائی۔ آپ کی وفات کے بعد وہ مال وجاہ کے حصول میں نہیں پڑے بلکہ اطراف کے ملکوں میں پھیل گئے۔ ہر صحابی کا گھر اس زمانہ میں ایک چھوٹا مدرسہ بنا ہوا تھا جہاں وہ صرف اللہ کی رضا کے لئے لوگوں کو عربی سکھاتے اور قرآن وسنت کی تعلیم دیتے۔ اس زمانہ میں ایک طرف مسلمانوں کا ایک طبقہ فتوحات اور سیاسی انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ عام طریقہ کے مطابق اصحاب رسول کو اپنا سیاسی حصہ لینے میں سرگرم ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ اس سے بے پروا ہو گئے۔ انھوں نے اسلامی فتوحات کے ذریعہ پیدا ہونے والی فضا کو تبلیغ دین کے لئے استعمال کیا، اس طرح ان کے اور ان کے شاگردوں کے خاموش پچاس سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ جغرافی خطہ وجود میں آیا جس کو عرب دنیا کہا جاتا ہے، جہاں لوگوں نے نہ صرف اپنے دین کو بدلا بلکہ ان کی زبان اور ان کی تہذیب بھی بدل گئی۔

پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لئے راضی ہو جانا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو سب سے پہلا مسئلہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ انصار بنو ساعدہ کی چوپال (سقیفہ) میں جمع ہو گئے۔ اس وقت سعد بن عبادہ انصار کے سب سے زیادہ ابھرے ہوئے سردار تھے۔ چنانچہ انصار میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ مقرر کیا جانا چاہئے۔ مہاجرین کو یہ خبر ملی تو ان کے ممتاز افراد تیزی سے چل کر مذکورہ مقام پر پہنچے۔ حضرت ابوبکر نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

أما ما ذكرتم فيكم من خير فأنتم له اهل، ولن تعرف العرب هذا الامر الا لهذا الحي من قريش: هم اوسط العرب نسبًا و دارًا، وقد رضيت لكم احد هذين الرجلين فبايعوا ايهما شئتم

(سیرۃ ابن ہشام، جزء رابع صفحہ ۳۳۹)

(اے انصار) تم نے اپنی جس فضیلت کا ذکر کیا ہے اس کے تم اہل ہو۔ مگر عرب اس معاملہ (امارت) کو قریش کے سوا کسی اور قبیلہ کے بارے میں نہیں جانتے۔ وہ عربوں میں نسب اور مقام کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔ میں تمھارے لئے ان دو آدمیوں (عمر اور ابو عبیدہ بن الجراح) میں سے کسی ایک پر راضی ہوں۔ تم دونوں میں سے جس سے چاہو بیعت کر لو

اس کے بعد حضرت عمر اٹھے اور انھوں نے فوراً حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی اور پھر تمام مہاجرین نے بیعت کی۔ اس کے بعد انصار نے بھی حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تاہم انصار کے ایک طبقہ کے لئے یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ ایک شخص نے مہاجرین سے کہا کہ تم لوگوں نے سعد ابن عبادہ کو قتل کر دیا (قتلتم سعد ابن عبادہ)

انصار نے اسلام کے لئے بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔ انھوں نے اسلام کے بے یار و مددگار قافلہ کو اس وقت پناہ دی جب کہ انھیں اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود انصار اس فیصلہ پر راضی ہو گئے کہ اقتدار میں ان کا حصہ نہ ہو اور خلیفہ صرف مہاجرین (قریش) میں سے منتخب کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے پیچھے بہت گہری مصلحت تھی۔ قریش سیکڑوں سال سے عرب کے قائد بنے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں اگر کسی غیر قریش کو خلیفہ مقرر کیا جاتا تو اس کے لئے اجتماعی نظم کو سنبھالنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ انصار کی حقیقت پسندی تھی کہ انھوں نے اپنی اس کمی کو جانا اور یک طرفہ فیصلہ پر راضی ہو گئے۔ تاہم یہ حقیقت پسندی کی اتنی نایاب قسم ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی طاقت

احد کی لڑائی اسلام کی تمام جنگوں میں سب سے زیادہ سخت لڑائی تھی۔ قریش کے تمام جنگی جوان غصہ میں بھرے ہوئے مسلمانوں کے اوپر ٹوٹ پڑے تھے۔ عین اس وقت جب کہ قتل و خون کا معرکہ گرم تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لی اور کہا کہ کون اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ لے گا۔ کچھ لوگ آپ کی طرف بڑھے۔ مگر آپ نے انھیں تلوار نہ دی۔ پھر ابو دجانہ سامنے آئے اور پوچھا کہ اے خدا کے رسول اس تلوار کا حق کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس سے دشمن کو مارو یہاں تک کہ اس کو ٹیڑھا کر دو (ان تضرب بہ العدو حتی ینحنی)۔ ابو دجانہ نے کہا کہ میں اس کو اس کے حق کے ساتھ لیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے انھیں تلوار دے دی۔

حضرت ابو دجانہ تلوار لے کر چلے۔ اس وقت ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ اکڑ کر چلنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ اس قسم کی چال خدا کو پسند نہیں سوا ایسے موقع کے (انھا لمشیۃ یبغضھا اللہ الا فی مثل ھذا الموطن)

ابو دجانہ نے اپنے سر پر لال کپڑا باندھ لیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ موت سے نڈر ہو کر جنگ کے لئے نکل پڑے ہیں۔ وہ انتہائی بہادری کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ جو بھی ان کے سامنے آتا وہ ان کی تلوار کا نشانہ بن جاتا۔ اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا جس کو خود ابو دجانہ ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

رایت انسانا یحمش الناس حمشا شدیدا — میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بری طرح لوگوں کو جنگ

فصمدت لہٗ فلما حملت علیہ السیف ولول فاذا امرأۃ فاکرمت سیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اضرب بہ امرأۃ

(سیرت ابن ہشام جزء ۳، صفحہ ۱۴)

پر ابھار رہا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ جب میں نے اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے کہا یا ویلاہ (ہائے تباہی) اب میں نے جانا کہ یہ ایک عورت ہے۔ تو میں نے خدا کے رسول کی تلوار کو اس سے پاک رکھا کہ اس سے میں کسی عورت کو قتل کروں

اس واقعہ کو ایک صحابی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: پھر میں نے دیکھا کہ ان کی تلوار ہند بنت عتبہ کے سر پر اٹھ گئی ہے مگر اس کے بعد انھوں نے اپنی تلوار اس سے ہٹالی (ثم رایتہ قد حمل السیف علی مفرق راس ھند بنت عتبۃ، ثم عدل السیف عنھا) جنگ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نہ مارا جائے۔ حضرت ابو دجانہ نے عین قتل و خون کے ہنگامہ میں اس کو یاد رکھا اور اپنی چلی ہوئی تلوار کو درمیان سے روک لیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب رسول کو اپنے جذبات پر کتنا زیادہ قابو تھا۔ ان کے افعال ان کے شعور کے ماتحت تھے نہ کہ ان کے جذبات کے ماتحت۔ وہ انتہائی اشتعال انگیز موقع پر انتہائی ٹھنڈا فیصلہ کر سکتے تھے۔ وہ غصہ اور انتقام کی آخری حد پر پہنچ کر بھی اچانک اپنا ذہن تبدیل کر سکتے تھے۔ وہ ایک رخ پر پوری رفتار سے چل پڑنے کے بعد معاً اپنا رخ دوسری طرف پھیر سکتے تھے۔ یہ بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر عملاً وہ اتنی زیادہ مشکل ہے کہ اس پر کوئی ایسا شخص ہی قادر ہو سکتا ہے جو خدا سے اس طرح ڈرنے والا ہو گویا خدا اپنے تمام جلال و جبروت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور وہ اس کو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

درخت کی طرح آگے بڑھنا

قرآن میں انجیل اور تورات کے دو حوالوں کا ذکر ہے۔ تورات کا حوالہ صحابۂ کرام کے انفرادی اوصاف سے متعلق ہے۔ اس کے بعد انجیل کے حوالے سے ان کی اجتماعی صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجرا عظیما (الفتح۔ آخر)

اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو۔ اس نے نکالا اپنا انکھوا۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر وہ موٹا ہوا۔ پھر اپنے تنہ پر کھڑا ہو گیا۔ اچھا لگتا ہے کسانوں کو تاکہ منکروں کا دل ان سے جلائے۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کئے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

موجودہ انجیل میں یہ تمثیل ان لفظوں میں ہے ـــــ اور اس نے کہا، خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی

آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے۔ اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے۔ پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے۔ کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (مرقس ۴: ۲۶-۳۲)

انجیل اور قرآن کی اس تمثیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ **پیغمبر آخرالزماں کے اصحاب کا اجتماعی ارتقاء درخت کی مانند ہوگا**۔ اس کا آغاز بیج سے ہوگا، پھر وہ دھیرے دھیرے بڑھے گا اور **اپنا تنہ مضبوط** کرتے ہوئے اوپر اٹھے گا۔ یہاں تک کہ فطری رفتار سے تدریجی ترقی کرتے ہوئے **اپنے کمال کو پہنچ جائے گا**۔ اس کی ترقی اتنی شان دار ہوگی کہ ایک طرف اہل ایمان اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے اور دوسری **طرف دشمن** دانت پیس رہے ہوں گے کہ اس کا معاملہ اتنا مضبوط ہے کہ اس کے خلاف ہمارا کچھ بس نہیں چلتا۔

اسلام کو درخت کی طرح ترقی دینے کے لئے خدا کا یہ منصوبہ تھا جو صحابہ کرام کے ذریعہ انجام پایا۔ تاہم یہ کوئی آسان معاملہ نہ تھا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ جلد بازی کے بجائے صبر کو اپنا طریقہ بنائیں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ فوری محرکات کے تحت وہ کوئی اقدام نہ کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے قوانین فطرت کی پیروی کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اس سے بے پروا ہو کر کام کریں کہ نتیجہ ان کی زندگی میں سامنے آتا ہے یا ان کے بعد۔ "درخت اسلام" کو اگانے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے جذبات کو کچلیں اور اپنی امنگوں کو دفن کر دیں۔ صحابہ کرام نے یہ سب کچھ کیا۔ انھوں نے کسی تحفظ کے بغیر اپنے آپ کو خدائی اسکیم کے حوالہ کر دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ زمین میں خدا کا دین ایک ایسے ابدی باغ کی صورت میں کھڑا ہو گیا جس کو ساری دنیا مل کر بھی مٹانا چاہے تو نہ مٹا سکے۔

مردانِ کار کی ضرورت

اکثر لوگ احیاء اسلام کی مہم کو اس کے "پروگرام" میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کو اسی وقت سمجھ پاتے ہیں جب کہ انھیں ایک متعین پروگرام بتا دیا جائے۔ مگر پروگرام کو تحریک کا بدل سمجھنا تحریک کی وسعتوں کی تصغیر (Underestimation) ہے۔ پروگرام ایک محدود نقشۂ کار کا نام ہے اور انسانی زندگی اس سے زیادہ وسیع ہے کہ وہ کسی محدود نقشہ کار کے دائرہ میں سما سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑا پروگرام خود افراد کو پروگرام ساز بنانا ہے نہ کہ افراد کے ہاتھوں میں کوئی لگا بندھا پروگرام دینا۔

اسلامی دعوت یہی کام کرتی ہے۔ حقیقی اسلامی دعوت افراد کے ذہن کو اس طرح جگا دیتی ہے کہ وہ خود پروگرام ساز بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں صرف توحید کی دعوت پیش کی تھی۔ آپ نے اس قسم کی کوئی چیز لوگوں کو نہیں دی جس کو موجودہ زمانہ میں "پروگرام" کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہر وہ شخص جو آپ کی دعوت سے متاثر ہوتا اس کو اپنے لئے مکمل پروگرام مل جاتا تھا۔ وہ آپ سے توحید کا شعور لینے کے بعد خود ہی سارا کام کرنے لگتا تھا۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ مکہ چھوڑ کر حبش گئے ان کو آپ نے معروف معنوں میں کوئی پروگرام نہیں بتایا تھا۔ مگر انھوں نے حبش میں اسلام کی اتنی کامیاب نمائندگی کی کہ اسلام بین اقوامی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہو گیا۔ آپ کی ہجرت سے پہلے جو مسلمان مدینہ گئے ان کو آپ نے قرآن کی سورتوں کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔ مگر انھوں نے مدینہ میں اسلامی دعوت کی مہم اس طرح چلائی کہ صرف چند سالوں میں مدینہ اس قابل ہو گیا کہ وہ دار الہجرت (اسلام کا مرکز) بن سکے۔

تقلیدی مذہب سے ہٹا کر شعوری مذہب پر لانے کی مہم سب سے بڑی انقلابی مہم ہے۔ وہ ایسے افراد وجود میں لاتی ہے جو اپنی ذات میں مکمل پروگرام ہوتے ہیں۔ ایسی مہم کی زد انسان کے پورے وجود پر پڑتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کو اس طرح جگاتی ہے کہ اس کے اندر ربانی حکمت کا چشمہ ابل پڑے۔ اب ایسے انسان وجود میں آتے ہیں جو خدا کے پاؤں سے چلیں، جو خدا کے ہاتھ سے پکڑیں، جو خدا کی آنکھ سے دیکھیں اور خدا کے کان سے سنیں۔ وہ حدیث کے الفاظ میں، وہ بے پناہ انسان بن جائیں جس کی ہوش مندی ہر دوسری چیز سے بلند تر ثابت ہوتی ہے (اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله) ایسا آدمی خود ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ اس کے پاس ہر سوال کا صحیح ترین جواب ہوتا ہے۔ وہ ہر موقع پر اپنے لئے کامیاب ترین راہ عمل تلاش کر لیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں یہی حکمت ربانی جگا دی تھی، اس کے بعد انھیں کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت میں وہ سب کچھ بھر دیا ہے جس کی اسے اپنی زندگی میں ضرورت ہے۔ عام حالات میں یہ فطرت ڈھکی ہوئی رہتی ہے۔ اسی انسانی فطرت سے جمود اور تعصب اور بے شعوری کے پردوں کو ہٹانا اسلامی دعوت کا اصل کام ہے۔ ان پردوں کے ہٹتے ہی انسانی فطرت اس آفاقی روشنی میں آجاتی ہے جس سے تمام زمین و آسمان جگمگا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہر چیز اس کو اپنے واقعی روپ میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور جو آدمی چیزوں کو ان کے واقعی روپ میں دیکھ لے اس کے لئے پروگرام کا مسئلہ اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے جتنا آنکھ والے ایک شخص کے لئے سیڑھی کے زینوں پر قدم رکھتے ہوئے کسی عمارت کے اوپر چڑھنا۔

یہاں میں ایک واقعہ نقل کروں گا جو اس مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے۔

ایک ہندستانی خاتون اپنے شوہر کے ساتھ طرابلس میں رہتی تھیں۔ وہ عربی نہیں جانتی تھیں۔ وہاں ان کی زندگی بالکل گھریلو زندگی تھی۔ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک روز رات کو اچانک ان کے شوہر کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ گھر میں بیوی کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا جو ڈاکٹر کو بلائے۔ طرابلس میں گھریلو ٹیلی فون بھی نہیں ہوتے کہ ٹیلی فون پر ڈاکٹر یا اسپتال سے رابطہ قائم کیا جائے۔ مگر بستر پر تڑپتا ہوا شوہر اور اس سے قلبی تعلق خاتون کے لئے اپنی ہر کمی کا بدل بن گیا۔ وہ رات کے سناٹے میں اپنے گھر سے نکلی۔ راستہ سے ناواقفیت، مقامی زبان سے اجنبیت، کسی ڈاکٹر کا نام یا پتہ معلوم نہ ہونا کوئی بھی چیز اس کے لئے رکاوٹ نہ بنی۔ وہ اپنی بیتابی کی رہنمائی میں چلتی رہی۔ یہاں تک کہ بے شمار مرحلوں سے گزرنے کے بعد بالآخر وہ ایک پاکستانی ڈاکٹر کے گھر پہنچ گئی۔ پاکستانی ڈاکٹر اس کی زبان (اردو) جانتا تھا۔ وہ فوراً اس کے ساتھ آیا۔ دیکھنے کے بعد اس نے سمجھ لیا کہ یہ اپنڈکس کا کیس ہے اور اس کا فوراً آپریشن ہونا چاہئے، چنانچہ اسی وقت وہ اس کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسپتال لے گیا۔ وہاں اس کا آپریشن ہوا اور چند دن کے بعد وہ اچھا ہو کر اپنے گھر واپس آگیا۔

اس قسم کا واقعہ ہر آدمی کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ ہر آدمی ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے جس کے بارے میں پہلے سے اس کے پاس کوئی نقشۂ عمل نہیں ہوتا۔ مگر وہ پوری طرح اس کا مقابلہ کرتا ہے اور بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ تاہم اس قسم کے قصے کسی کے ساتھ ہمیشہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے ذاتی معاملات میں پیش آتے ہیں۔ اگر تعلق اور دلچسپی کا یہی درجہ دین کے ساتھ پیدا ہو جائے تو دین کے معاملات بھی اسی طرح حل ہونے لگیں جس طرح لوگ اپنے ذاتی معاملات روزانہ حل کر رہے ہیں۔ پھر لوگوں کے لئے نہ دینی تقاضوں کو جاننا مشکل رہے اور نہ دین کے لئے قربانی دینا۔ وہ اپنے پروگرام کو اسی طرح پالیں جس طرح مذکورہ خاتون نے اپنے ڈاکٹر کو پالیا۔

ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس نقشۂ کار کیا ہے۔ آہ، لوگوں کو کس طرح بتایا جائے کہ نقشۂ کار کی نہیں بلکہ مردانِ کار کی ضرورت ہے۔ کوئی واقعہ خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اس کو برپا کرنے والے ہمیشہ انسان ہوتے ہیں۔ نہ کہ کوئی پروگرام یا نقشۂ کار۔ اجتماعی زندگی میں انقلاب ہمیشہ وہ لوگ لاتے ہیں جو اپنی ذات میں پروگرام ہوں نہ کہ وہ لوگ جنھیں کوئی لگا بندھا ڈھرا دے دیا جائے اور اس پر وہ دوڑتے رہیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کا واقعہ ہے۔ ایک بار انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ وہ ہاتھ اٹھائے خاموش دعا کرتے رہے۔ اس وقت اورنگ زیب کے پیچھے ان کے وزیر سعد اللہ خاں کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا: عالی جاہ، آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر راس کماری تک لہرا رہا ہے، کیا اس کے بعد بھی کوئی ارمان ہے جو آپ کے دل میں باقی رہ گیا ہے۔ اورنگ زیب یہ سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہے اور اس کے بعد تاثر کے ساتھ کہا: سعد اللہ، مردے خواہم (سعد اللہ، میں ایک مرد چاہتا ہوں)

اورنگ زیب کے پاس وہ چیز مکمل طور پر موجود تھی جس کو نقشۂ کار کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے پاس حکومت اور وسائل بھی پوری طرح موجود تھے۔ اس کے باوجود وہ مغل سلطنت کو مستحکم بنانے میں اس لئے ناکام ہو گیا کہ اس کے پاس مردانِ کار نہ تھے۔ اگر اورنگ زیب کے پاس سچے مردان کار کی ٹیم موجود ہوتی تو اورنگ زیب کے بعد آنے والی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جیسا کہ اب ہمیں نظر آتی ہے۔

اسلام کے مشن کو آج انسانوں کی بھیڑ میں انسان کی تلاش ہے۔ خدا کے نام پر بولنے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس کو خدا کے خوف نے چپ کر رکھا ہو، دنیا کے پیچھے دوڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کی راہ دیکھ رہا ہے جو آخرت کی خاطر کھڑا ہو گیا ہو۔ خدا کے نام پر خوشیاں منانے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو ڈھونڈھ رہا ہے جس کو خدا کی یاد نے رونے پر مجبور کر دیا ہو۔ اپنی انا کا جھنڈا اٹھانے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس نے خدا کو اس طرح پایا ہو کہ اس کے پاس ایک بے انا روح کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا ہو۔ دین کے نام پر لڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو تلاش کر رہا ہے جس نے دین کی خاطر لڑائی بھڑائی چھوڑ دی ہو۔ حاسبوا اعیادکم کا جھنڈا اٹھانے والی فوج کے درمیان وہ ان لوگوں کا انتظار کر رہا ہے جو حاسبوا انفسکم کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آج اسلام کو مطلوب ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے ذریعہ اسلام دوبارہ فکری غلبہ کا مقام حاصل کرے گا۔

آج اسلام کو ایسے انسان درکار ہیں جو اپنے کو اس حد تک خالص کریں کہ وہ ظواہر سے گزر کر حقیقت کو دیکھنے لگیں۔ جو اس صبر کے حامل ہوں کہ غیر متعلق مسائل سے اپنا دامن بچا کر اصل نشانہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز

رکھیں۔ جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو اتنا ہیچ سمجھیں کہ دنیا کی ہر قربانی دینا ان کے لئے آسان ہو جائے۔ جو اتنے زیادہ حقیقت پسند ہوں کہ اپنے مقابلہ میں دوسروں کی خوبی دیکھ سکیں اور اپنی سیٹ پر دوسرے کو بٹھا سکیں۔ جو حقائق کو اس طرح دیکھنے لگیں کہ کوئی لفظی شوشہ انھیں اس سے بدکانے والا ثابت نہ ہو۔ جو منفی جذبات سے اس قدر خالی ہوں کہ کوئی ذاتی رنجش انھیں منحرف نہ کر سکے اور کسی کی ترقی انھیں حسد میں مبتلا نہ کرے۔ جو دوسرے کو اپنے مقام پر رکھ کر دیکھیں اور اپنے کو دوسرے کے مقام پر۔ جو ظواہر سے زیادہ حقیقت کے دلدادہ ہوں۔ اور حال سے زیادہ مستقبل پر نظر رکھتے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ وہ دنیا کے بجائے آخرت میں جیتے ہوں اور اپنی بڑائی کے بجائے خدا کی بڑائی میں گم ہو چکے ہوں۔ ایسے ہی لوگوں نے دور اوّل میں اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کیا تھا اور ایسے ہی لوگ دور ثانی میں بھی اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ پروگرام کا سوال اصلاً افراد تیار کرنے کا سوال ہے۔ افراد کسی تربیتی نظام میں نہیں ڈھلتے اور نہ کسی قسم کے خارجی ہنگاموں کے درمیان بنتے ہیں۔ افراد تیار کرنے کی صورت تو صرف یہ ہے کہ دین قیم کی بنیاد پر ایک ایسی بے آمیز تحریک اٹھے جو فطرت انسانی کو مس کرنے والی ہو۔ جو آدمی کے باطن میں ضرب لگا کر اس کے اندر سوئے ہوئے ربانی انسان کو جگا دے، جو انسان کے فکر میں خدا کا رنگ اس طرح گھولے کہ اس کی پوری ہستی خدا کے رنگ میں رنگ جائے۔

ایسی تحریک حالات کے ردعمل کے طور پر نہیں اٹھتی۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کا ابدی نغمہ چھیڑنے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ وہ کتاب الٰہی کی حکمت کو لسان عصر میں کھولتی ہے۔ وہ پیغمبرانہ دعوت کا زمانی اظہار ہوتی ہے۔ وہ خدا اور انسان کے درمیان ربط بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ سورج کی روشنی اور پھولوں کی مہک کی طرح خدا کے تخلیقی حسن کا نمونہ ہوتی ہے۔ کسی معاشرہ میں ایسی تحریک کا اٹھنا اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ وہاں وہ ربانی انسان بن کر اٹھیں جو اپنی ذات میں پروگرام ہوں۔ تاہم پیغمبروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی دعوت اٹھنے کے بعد بھی عملاً صرف وہی لوگ اس سے فیض یاب ہوتے ہیں جو پہلے سے اپنے اندر زرخیزی کا مادہ رکھتے ہوں۔ بنجر زمین بارش سے پہلے بھی بنجر رہتی ہے اور بارش کے بعد بھی۔ بنجر (والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لا یخرج الا نکدا، الاعراف ۵۸)

اسلام کی نئی تاریخ شروع کرنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ انسانوں کی ایسی جماعت ہے جس کی فطری صلاحیتیں زندہ ہوں۔ تاکہ اس کو جب اسلام کی دعوتِ فطرت کا مخاطب بنایا جائے تو وہ اس کو صحیح طور پر قبول کر سکے۔ جب اس کے اندر اسلام کا بیج ڈالا جائے تو اس کی کھیتی اس طرح لہلہا اٹھے جس طرح زرخیز زمین میں دانہ ڈالنے کے بعد اس کی فصل لہلہا اٹھتی ہے۔ اسلام کی دعوت اپنی قبولیت کے لئے آج ایسے کسی گروہ کا

انتظار کر رہی ہے۔ اس قسم کے زندہ افراد اگر مسلمانوں میں سے نکل آئیں تو یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے اور اگر ایسے جاندار لوگ مسلمانوں میں سے نہ نکلیں تو خدا کسی دوسری قوم کو یہ توفیق دے گا اور اس کے اندر سے ایسے زندہ افراد اٹھائے گا جو اسلام کی بارش سے نہائیں اور دنیا کو اس میں نہلانے کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیں (وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم)

اوپر ہم نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے متعلق دعا کی کہ خدایا یہ گروہ (العصابہ) اگر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔ یہ اصحاب بدر کل ۳۱۳ تھے۔ مگر یہی ۳۱۳ کی تعداد رسول کی نظر میں فیصلہ کن بن گئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے غلبہ کے لئے اصل میں جو چیز درکار ہے وہ کسی قسم کی بھیڑ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ بھیڑ کے اندر دعوتی عمل کر کے اس کے زندہ افراد کو اس سے نکال لیا جائے۔ یہ زندہ افراد خواہ ۳۱۳ ہوں مگر ان کو انسانیت کا خلاصہ ہونا چاہئے۔ شعور کے اعتبار سے وہ شعور ربانی کے ہم سطح ہوں اور عمل کے اعتبار سے وہ اخلاق خداوندی کا پیکر بن چکے ہوں۔ ان کا سوچنا اور کرنا دونوں خدا کی میزان عدل میں پورا اتر رہا ہو۔ ایسے گروہ کو چھانٹ کر نکالنا ہی دعوت اسلامی کا اصل مقصود ہے۔ جس دن ایسا گروہ وجود میں آجائے گا تو خواہ وہ ۳۱۳ جیسی اقلیت میں کیوں نہ ہو وہ خدا کی مدد سے خدا کے دین کو غلبہ کے مقام پر پہنچا کر رہے گا۔ ایسا ایک گروہ ہمیشہ خدا کی فرقان ہوتا ہے۔ اور جو گروہ خدا کی فرقان بن جائے اس کے لئے اس دنیا میں غلبہ کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

اسلام دور جدید میں

اسلام چونکہ آخری دین ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے وجود کے اعتبار سے قیامت تک باقی رہے۔ اسی لئے دین کا تحفظ بھی ایک ضروری اور مطلوب کام ہے۔ موجودہ زمانہ کی بعض تحریکوں نے اس اعتبار سے یقیناً مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اسلام کے فکری اور عملی نقشہ کی محافظ ثابت ہوئی ہیں۔ بعض ادارے قرآن اور حدیث اور اسلامی مسائل کے علم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعض جماعتیں اسلامی عبادات کے ڈھانچہ کو ایک نسل سے دوسری تک پہنچانے کا کام کر رہی ہیں۔ کچھ اور ادارے قرآن و حدیث کا متن صحت و صفائی کے ساتھ چھاپ کر ہر جگہ پھیلا رہے ہیں۔ یہ تمام کام بجائے خود مفید ہیں مگر بہرحال وہ تحفظ دین کے کام ہیں نہ کہ دعوتِ دین کے۔ جہاں تک اسلام کو دعوتی قوت کی حیثیت سے زندہ کرنے کا سوال ہے وہ موجودہ زمانہ میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید اس کا شعور بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر ایسے کاموں کو اسلامی دعوت کا عنوان دے دیتے ہیں جن کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ میں کسی حقیقی اسلامی کام کے آغاز کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس صورت حال کو ختم کریں جس نے ساری دنیا میں اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک کے ہم معنی بنا رکھا ہے۔ مسلمان ہر ملک میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف شور و شر برپا کرنے میں مشغول ہیں۔ کہیں ان کی یہ تحریک غیر مسلم اقتدار کے خلاف برپا ہے اور کہیں مسلم اقتدار کے خلاف۔ کہیں وہ مسلح جد وجہد کے روپ میں ہے اور کہیں زبانی اور قلمی احتجاج کے روپ میں۔ کہیں وہ ایک اسلامی سیاسی فلسفہ کے زیر سایہ کام کر رہی ہے اور کہیں فلسفہ اور نظریہ کے بغیر متحرک ہے۔ کہیں اس نے ملی عنوان اختیار کر رکھا ہے اور کہیں نظامی عنوان۔ تاہم سارے فرق و اختلاف کے باوجود نتیجہ سب کا ایک ہے — جدید امکانات کو دعوت توحید اور انذار آخرت کے لئے استعمال نہ کرنا اور اپنی قوتوں کو بے فائدہ طور پر مفروضہ حریفوں کے خلاف محاذ آرائی میں ضائع کرتے رہنا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بالکل الٹی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ خدا نے دعوتِ حق کی راہ سے سیاسی رکاوٹ کو دور کر کے انھیں موقع دیا تھا کہ وہ آزادانہ حالات میں خدا کے تمام بندوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی اس اسکیم سے باخبر کر دیں جس کے تحت اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق وہ ایک ایک شخص کا حساب لینے والا ہے۔ مگر انھوں نے دوبارہ نئے نئے عنوان سے اپنے خلاف سیاسی رکاوٹیں کھڑی کر لیں۔ خود ساختہ سیاسی جہاد میں ہر ایک مشغول ہے۔ مگر دعوتی جہاد میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

قرآن میں ہے کہ اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرے (حج ۴۰) ہر دور میں خدا اپنے دین کے حق میں کچھ امکانات کھولتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہوں جو خدا کے اشارہ کو سمجھیں اور خدا کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کر دیں۔ صحابہ کرام وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ میں خدائی منصوبہ کو سمجھا اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہ عظیم انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔

بارش کا آنا خدا کے ایک منصوبہ کا خاموش اعلان ہے۔ یہ کہ آدمی اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اپنے کائناتی انتظام کو اس کے موافق کر کے اس کے بیج کو ایک پوری فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ کسان اس خدائی اشارہ کو فوراً سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو اس خدائی منصوبہ میں پوری طرح شامل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں اس کو واپس ملتا ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں، ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں، اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے حق میں کچھ نئے مواقع کھولے تھے۔ یہ مواقع کہ اقتدار کا حریف بنے بغیر توحید اور آخرت کی دعوت کو عام کیا جائے۔ جو کام پہلے معجزاتی سطح پر انجام دینا پڑتا تھا، اس کو عام طبیعیاتی استدلال کی سطح پر انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے تعصب کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا اس کو مذہبی رواداری

کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے "حیوانی رفتار" سے کیا جاتا تھا اس کو "مشینی رفتار" کے ساتھ انجام دیا جائے۔

یہ موجودہ زمانہ میں خدا کا منصوبہ تھا۔ خدا نے سارے بہترین امکانات کھول دیے تھے اور اب صرف اس کی ضرورت تھی کہ خدا کے کچھ بندے ان کو استعمال کر کے ان امکانات کو واقعہ بننے کا موقع دیں۔ مگر مسلم قیادت خدا کے اس منصوبہ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے نئے نئے عنوانات کے تحت وہی سیاسی جھگڑے دوبارہ چھیڑ دیے جن کو خدا نے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں ختم کیا تھا۔ انھوں نے اسلامی دعوت کو سیاسی اور قومی دعوت بنا کر دوبارہ اسلام کو اقتدار کا حریف بنا دیا اور کہا کہ یہی عین خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو قوموں کے ساتھ ہر جگہ بالکل بے فائدہ قسم کی مقابلہ آرائی شروع ہو گئی اور سارے نئے امکانات غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہ گئے۔ مسلمانوں اور دیگر قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔

کام کی ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت مسلمانوں نے کھو دی۔ یہاں تک کہ شیطان نے بیدار ہو کر قدیم شرک کی جگہ جدید شرک (کمیونزم) کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ اب کم از کم کمیونزم کے زیر تسلط علاقوں میں دوبارہ کام کرنے کی وہی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں جو اس سے پہلے شرک کے زیر تسلط علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ تاہم غیر کمیونسٹ دنیا میں اب بھی کام کے مواقع کھلے ہوئے ہیں اور یہاں پندرھویں صدی ہجری میں اس صالح جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں نہ کیا جا سکا۔

آزادی نے ہمیں
ترقّی کا موقع دیا
نیا 20 نکاتی
پروگرام
راہ دکھاتا اور تحریک
دیتا ہے
"قوم کے لئے یہ کارروائی نامہ
ترقی کے مجموعی منصوبے سے منسلک کیا گیا ہے۔ یہ ان میدانوں
کی نشاندہی کرتا ہے جن میں خصوصی کام کرنے سے مختلف طبقوں
کے لئے فوری اور واضح نتائج برآمد ہو سکتے ہیں"
اسے کامیابی سے بروئے کار لانے کے لئے
ہر ایک شہری کے تعاون کی ضرورت ہے۔
آیئے مل جل کر ایک ٹیم کی طرح کام کریں
"یہ پروگرام آپ سب کے لئے اور اس ملک کے لئے ہے جو
ہمارا ملک ہے۔ جس کی خدمت، نشو و نما اور تعمیر ہمیں کرنی ہے۔
اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے میں آپ سے پورے دل
تعاون کی اپیل کرتی ہوں"
— وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی
آزادی کا 36 واں سال —— 9 ویں ایشیائی کھیلوں کا سال

davp 82/211

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوّت اور
پورا فائدہ مِلتا ہے؟

اپنی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا
اِس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا
ٹھیک اور طاقتور ہے۔

سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں
طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی
اجزاء کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا،
دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ جڑی
بوٹیاں شامل ہیں۔ اِس مرکّب سے آپ کے
نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن
اس کی مدد سے آپ کی روزمرّہ خوراک سے
صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصِل کرتا ہے۔

سنکارا

ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک

HD-5949 AU

ہمدرد

ثانی ثمنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD.NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 70
SEPTEMBER 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱- الاسلام	۰-۱۵
۲- مذہب اور جدید چیلنج	۰-۱۵
۳- ظہورِ اسلام	۰-۱۵
۴- دین کیا ہے؟	۰-۲
۵- قرآن کا مطلوب انسان	۰-۵
۶- تجدید دین	۰-۳
۷- اسلام دینِ فطرت	۰-۳
۸- تعمیرِ ملت	۰-۳
۹- تاریخ کا سبق	۰-۳
۱۰- مذہب اور سائنس	۰-۵
۱۱- عقلیاتِ اسلام	۰-۳
۱۲- فسادات کا مسئلہ	۰-۲
۱۳- انسان اپنے آپ کو پہچان	۰-۱
۱۴- تعارفِ اسلام	۰-۵۰
۱۵- اسلام پندرھویں صدی میں	۰-۲
۱۶- راہیں بند نہیں	۰-۳
۱۷- دینی تعلیم	۰-۳
۱۸- ایمانی طاقت	۰-۳
۱۹- اتحادِ ملت	۰-۳
۲۰- سبق آموز واقعات	زیر طبع
۲۱- اسلامی تاریخ سے	"
۲۲- قال اللہ	"
۲۳- اسلامی دعوت	۰-۳
۲۴- زلزلۂ قیامت	۰-۴
۲۵- سچا راستہ	۰-۱

مکتبہ الرسالہ - دہلی-۶